ایک نائی اور رنگساز کا قصّہ

اطہر پرویز

ایک نائی اور رنگساز کا قصّہ

اطہر پرویز

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک ۱ - آر کے پورم، نئی دہلی 110066

Ek Nai Aur Rangsaz Ka Qissa

by

Athar Parvez

سنہ اشاعت :

پہلا ایڈیشن : 1977

چوتھا ایڈیشن : 2006، تعداد : 1100

قیمت : -/20 روپے

سلسلۂ مطبوعات : 535

ISBN : 81-7587-119-9

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159

ای۔میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: فہمی کمپیوٹرس، جامع مسجد، دہلی-006 110

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے بُرے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا ہے اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کر سکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ اپنے بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔

ایس۔ موہن

ڈائرکٹر انچارج

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند، نئی دہلی

فہرست

ایک نائی اور رنگساز کا قصّہ

کہتے ہیں کہ اسکندریہ میں ایک رنگساز تھا اور ایک نائی۔ رنگساز کا نام تھا ابو قیر اور نائی کا نام تھا ابو صیر۔۔۔۔ رنگساز اور نائی کی دکانیں بالکل پاس پاس تھیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کے بڑے گہرے دوست تھے۔

ابو قیر رنگساز بڑا جھوٹا، مکّار اور دھوکے باز تھا۔ اس کا زیادہ وقت بدمعاشوں کی صحبت میں گزرتا۔ اپنے کاروبار میں بھی وہ اپنے گاہکوں کو صبح سے شام تک دھوکا دیتا رہتا تھا۔ اس کے دھوکا دینے کے بہت سے طریقے تھے۔ مثلاً کپڑا رنگنے سے پہلے ہی وہ گاہکوں سے پیسے لے لیتا تھا۔ اس کے بعد وہ ان کو ٹالتا رہتا تھا۔ وہ بیچارے صبح و شام دکان کے چکر لگاتے اور یہ ان سے طرح طرح کے بہانے کرتا۔ کبھی کہتا رنگ نہیں ملا، کبھی یہ کہتا کہ بیوی کی بیماری کی وجہ سے نہیں رنگ سکا۔ کبھی اپنی بیماری کا بہانا کر کے ٹالتا۔ کبھی یہ کہہ کر ٹالتا کہ مہمان آگئے تھے اس لیے کوئی

کام نہ کر سکا۔ آخر میں جب وہ عاجز آجاتے تو یہ کہتے کہ "بھائی اگر رنگ نہیں سکے تو ہمارا کپڑا ہی واپس کردو۔"
اس کے جواب میں وہ منہ بنا کر کہتا۔" کیا بتاؤں! اصل بات کیا ہے!"
جب وہ اصل بات دریافت کرتے تو یہ کہتا کہ "اصل بات یہ ہے کہ میں نے خوب اچھی طرح سے رنگنے کے بعد جب اسے باہر سوکھنے کے لیے لٹکایا تو وہ چوری ہو گیا۔" اور پھر وہ آہستہ سے کہتا" چور کا تو مجھے پتا ہے، لیکن پڑوس کی بات ہے کہوں تو کیسے کہوں کہ ہمارے پڑوسی نائی نے چوری کی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیسے منہ دکھاؤں۔"
اور اس کے جواب میں اس کے گاہک یہی جواب دیتے "خیر کوئی بات نہیں۔ اب گیا تو گیا، ہمیں اللہ اور دے گا۔"
وہ بیچارے چپ چاپ اپنا سا منہ لے کر چلے جاتے۔ حالانکہ ان کا کپڑا بھی گیا اور رنگائی کے پیسے بھی۔ جب کہ سچی بات یہ ہوتی کہ وہ یہ روپیہ پیسا کھا پی کر برابر کر لیتا۔ اور گاہکوں کے کپڑے بھی ڈکار لیتا۔۔۔۔ بعض اوقات تو لوگ اس سے لڑائی جھگڑا بھی کرتے۔ لیکن وہ اپنی حرکتوں سے کبھی باز نہ آتا۔ وہ طرح طرح سے لوگوں کو پریشان کرتا۔ اس کے گاہک کسی سے شکایت بھی نہ کر پاتے۔

وہ یہ سوچتے کہ کپڑا تو گیا — اب کون جھگڑے میں پڑے۔ پھر اگر قاضی کے پاس اس کی شکایت بھی کرتے تو سوال یہ تھا کہ اُن کے پاس کوئی ثبوت بھی تو نہ تھا۔ قاضی تو ثبوت مانگتا تھا۔

غرض اس طرح ابوقیر بہت دنوں تک اپنا کام چلاتا رہا۔ لوگوں سے پیسے لیتا، اُن کے کپڑے بیچتا اور سیر و تفریح کرتا۔ لیکن یہ سلسلہ آخر کب تک چلتا۔ کچھ دنوں کے بعد شہر کے ایک اک آدمی کو معلوم ہو گیا کہ ابوقیر رنگساز دھوکے باز ہے۔ وہ لوگوں کے پیسے بھی کھا جاتا ہے اور اُن کے کپڑے بھی بیچ ڈالتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں نے اپنا کام لانا بند کر دیا۔ اس کا کاروبار ختم ہو گیا اور اس کی دکان پر سناٹا چھا گیا۔ وہ یہاں تک بدنام ہو گیا کہ جب لوگ کسی کو دھوکے باز کہنا چاہتے تو یہی کہتے کہ "تم ابوقیر رنگساز ہو گئے ہو۔"

جب ابوقیر اس حال کو پہنچ گیا تو پھر اس کو فاقے کی نوبت آ گئی۔ اب وہ اپنے پڑوسی ابوصیر حجّام کی دکان پہ بیٹھنے لگا۔ اب اس کا کام یہ تھا کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا گاہک کپڑے لے کر آتا تو یہ ابوصیر حجام کی دکان سے اُٹھ کر اس کے پاس جاتا اور اس سے رنگائی کے کپڑے اور پیسے لے لیتا۔ اس کے بعد بازار میں جا کر کپڑا بیچ دیتا اور چند روز مزے کی زندگی گزارتا۔ اب جب وہ آدمی اپنا

کپڑا لینے آتا تو یہ حجام کی دکان میں چھپ جاتا۔ اتفاقاً ایک روز ایک رئیس آیا۔ اس نے بھی ابو قیر کو کپڑے رنگنے کے لیے دیے۔ ابو قیر نے حجام کی دکان سے نکل کر کپڑا تو لے لیا۔ لیکن اس کے ساتھ بھی یہی کیا کہ وہ کپڑا بھی لے جاکر شہر میں بیچ دیا۔ اتفاق سے یہ آدمی شہر میں بہت اثر رکھتا تھا۔ اس نے قاضی سے شکایت کی اور پولیس کے آدمی کو لے آیا۔ ابو قیر نے جو پولیس کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ آج اس کی شامت آئی ہے۔ چنانچہ وہ چپ چاپ حجام کی دکان سے نکل کر بھاگا ـــــ جب پولیس والے آئے تو انھوں نے ابو قیر کو نہ پایا اور دکان کا تالا توڑا۔ مگر ان کو حیرت ہوئی کہ دکان میں تمام ٹوٹا پھوٹا سامان تھا۔ وہ آدمی بہت مایوس ہوا۔ قاضی کے آدمیوں نے دکان کی کنجی اس آدمی کے حوالے کی اور پڑوسی دکانداروں سے کہا کہ "ابو قیر سے کہنا کہ ہمارا کپڑا دے دے اور اپنی کنجی لے لے" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

اس کے بعد جب رنگساز، حجام کی دکان میں آیا تو ابو صیر نے پوچھا "میرے بھائی تم لوگوں کو اس طرح کیوں پریشان کرتے ہو کہ ان کے کپڑے تک واپس نہیں کرتے"

ابو قیر نے کہا ـــــ "کیا بتاؤں، جب کپڑے رنگنے کے لیے آتے ہیں تو کوئی نہ کوئی انھیں چرا کر لے جاتا ہے"

ابو صیر نے کہا "یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ ہر ایک

کے کپڑے چوری ہو جاتے ہیں۔ اس بازار میں سوائے تیرے اور کسی کی دکان میں چوری نہیں ہوتی۔ میرا تو خیال ہے کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ مجھے سچ سچ بتا کہ معاملہ کیا ہے۔"

یہ سن کر رنگساز نے کہا "بھائی سچ تو یہ ہے کہ کسی نے کپڑے نہیں چرائے۔"

حجام نے کہا "پھر وہ کپڑے کہاں گئے؟"

رنگساز نے کہا "بات یہ ہے کہ میرے پاس رنگنے کا کوئی سامان نہیں ہے۔ میرے حالات بہت خراب ہیں۔" اس نے حجام کو سچ سچ پوری بات بتا دی۔ حجام کو رنگساز پر بڑا ترس آیا۔ اس نے کہا "کوئی بات نہیں ہے تم میرے ساتھ رہو۔ جو میں کماتا ہوں وہ کھاؤ —— آخر میں بھی تو تمہارا پڑوسی ہوں۔ میرا فرض ہے کہ میں بھی تمہارے کام آؤں۔"

اب ابو قیر رنگساز، حجام ابو صیر کے ساتھ رہتا۔ ایک دن ابو صیر نے اس سے کہا —— "میرے بھائی! ایسا خراب زمانہ آیا ہے کہ میرا کاروبار بھی خراب ہو رہا ہے۔ دکان کے آئینے ٹوٹ گئے ہیں۔ میرے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ نئے آئینے لاؤں۔ اسی طرح حمام میں کوئی سامان نہیں ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔"

ابو قیر نے کہا "بھائی، کاروبار کا یہی حال ہے بغیر پیسے کے کوئی کام نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے میرا کام ختم ہو گیا۔ حالانکہ تمہارے مقابلے کا حجام اس شہر میں کوئی اور

نہیں ہے۔ اگر تم کہو تو میں تم کو ایک رائے دوں۔"

حجام نے کہا "تم تو میرے بہت عزیز دوست ہو۔ تم سے رائے نہ لوں گا تو کس سے لوں گا؟"

ابو قیر نے کہا "میری رائے یہ ہے کہ ہم دونوں یہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے چلیں اور وہاں اپنا کاروبار شروع کریں۔ تم جانتے ہو کہ میرا جیسا رنگساز اس شہر میں کوئی نہیں ہے۔ اور تمہارا بھی اپنے کام میں یہی حال ہے۔ لیکن کیا کریں کہ اس شہر میں ہمارا کوئی قدردان نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے شہر میں جاکر ہماری تقدیر کے دروازے کھل جائیں گے اور ہمارا کاروبار ضرور ترقی کرے گا۔ بس ہمارے یہاں سے نکلنے کی دیر ہے۔" اس کے بعد ابو قیر نے حجام سے سفر کے بہت سے فائدے بیان کیے۔

ابو صیر پر بہت اثر ہوا اور اس نے طے کر لیا کہ وہ اس شہر کو چھوڑ دے گا۔ چنانچہ اس نے اپنی دکان کا سارا سامان بیچنا شروع کر دیا۔ جب سب سامان بک گیا اور اس کے ہاتھ کچھ روپیہ پیسہ آگیا تو پھر دونوں نے سفر کا دن مقرر کیا۔ اس وقت ابو قیر نے حجام سے کہا ——— "میرے بھائی! ہم لوگ قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ ہم میں سے جو آدمی بھی روپیہ کمائے گا تو دونوں مل کر خرچ کریں گے اور جب یہاں واپس آئیں گے تو جو کچھ بچے گا اس کو برابر بانٹ لیں گے۔"

ابو صیر نے یہ بات مان لی اور قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ عہد

گیا۔ اب یہ دونوں بندرگاہ پر پہنچے، اور ایک جہاز پر سوار ہو گئے۔ اس جہاز پر کُل ملا کر ایک سو چالیس مسافر تھے۔ ان دونوں کی قسمت اچھی تھی کہ ان میں کوئی حجام نہیں تھا۔ رنگساز نے کہا " میرے بھائی! یہ بڑا اچھا موقع ہے۔ کیوں نہ اپنی قسمت کو یہیں آزمائیں تم اپنا اُسترا اور قینچی لے کر اپنا کام شروع کر دو۔"

یہ بات حجام کی بھی سمجھ میں آگئی۔ اس نے اپنا سامان لیا۔ ایک آدمی نے جو حجام کو دیکھا تو کہا ——— " بھائی! میرے بال بہت بڑھ گئے ہیں۔ ذرا میری حجامت بنادو۔"

ابوصیر نے اُس کے بال بنائے۔ اس نے فوراً پیسے نکال کر دیے۔ ابوصیر نے کہا " حضور! میں یہ پیسے لے کر کیا کروں گا۔ میرے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے اگر کچھ کھانے کو دے دیں تو اچھا ہے۔ میرا ایک دوست بھی ہے۔ ہم دونوں کھا پی کر رات گزار لیں گے۔" اس آدمی نے فوراً ابوصیر کو کچھ کھانا دے دیا۔ جب ابوصیر کھانا لایا تو ابوقیر بہت خوش ہوا اور پھر دونوں نے بیٹھ کر کھایا۔ اب تو ابوصیر یہی کام کرنے لگا اور اس کا کام اچھا خاصا چل نکلا اور دونوں خوب آرام سے کھاتے پیتے۔ حجام صبح سے شام تک اپنا کام کرتا۔ کسی سے روٹی ملتی تو کسی سے پنیر تو کسی سے گوشت اور رنگساز کا تو یہ حال تھا کہ دن بھر چادر تان کر سوتا۔ بس کھانے کے لیے اُٹھتا اور کھانا کھاکر

پھر سو جاتا۔ ابو صیر لوگوں سے بڑی محبت سے بات کرتا۔ اگر کوئی اسے کچھ دے دیتا تو اسے قبول کر لیتا۔ کسی سے حجت بحث نہ کرتا۔ جہاز کے سب مسافر اس سے محبت کرنے لگے اور اس کا خیال رکھتے۔ ایک روز جہاز کے کپتان کو بھی ابوصیر کا حال معلوم ہوا۔ وہ بھی بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنے بال بنوائے۔ اب تو ابو صیر کی کپتان سے بھی دوستی ہو گئی۔ ابوصیر نے اسے اپنی اور اپنے دوست کی پریشانی کا حال سُنایا۔ کپتان بہت اچھا آدمی تھا، حجام اور رنگساز کی پریشانی کا حال سُن کر کپتان پر بہت اثر ہوا اور اس نے کہا ــــ "بھائی! تم کو زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ رات کو تم دونوں میرے ساتھ کھانا کھا لیا کرو۔"

اس روز شام کو جب حجام واپس رنگساز کے پاس آیا تو اس کے پاس کھانے کا بہت سامان تھا۔ ابو قیر اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بڑی تیزی سے اُن پر جھپٹا۔

ابو صیر نے کہا "ارے بھائی! آج اس کو کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے رکھو۔ یہ پھر کبھی کام آئے گا ــــ آج جہاز کے کپتان نے ہم دونوں کی دعوت کی ہے۔ اس لیے آؤ ہم کپتان کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ اس نے تم کو بھی بلایا ہے۔"

ابو قیر نے کہا "بھائی کپتان کے پاس تو تم ہی کھانے جاؤ۔ میری تو طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے میرا تو اپنی

جگہ سے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو یہی معمولی کھانا کھاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ اب تو اُس کی حالت یہ تھی کہ وہ جلدی جلدی دونوں ہاتھوں سے کھانے لگا۔ سچ پوچھو تو وہ کھا نہیں رہا تھا بلکہ نگل رہا تھا۔ اس کے منہ سے لقمہ نکل نکل پڑتا تھا لیکن وہ اسے پھر منہ میں ٹھونس لیتا تھا۔ اس کی دسوں انگلیاں کھانے میں لت پت ہو رہی تھیں۔ غرض وہ بڑے بھونڈے پن سے کھا رہا تھا۔ اتنے میں کپتان کا نوکر آیا اور اس نے کہا ——— "آپ کو کپتان صاحب یاد کر رہے ہیں، انھوں نے آپ کو کھانے پر بلایا ہے۔

ابو صیر نے رنگساز سے کہا "اگر تمہارا جی چاہے تو تم بھی چلو۔"

مگر ابو قیر راضی نہ ہوا۔ اس نے کہا "میرے اندر اس وقت اُٹھنے کی طاقت نہیں ہے۔"

ابو صیر اکیلا چلا گیا۔ وہاں دیکھا تو سامنے کھانا لگا ہوا تھا اور کپتان کھانے پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دستر خوان پر طرح طرح کے کھانے لگے ہوئے تھے۔ کپتان نے پوچھا "ابو صیر! تمہارا دوست نہیں آیا، جو تم اکیلے آرہے ہو؟"

ابو صیر نے کہا "اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کو سمندر کی آب و ہوا راس نہیں آئی۔"

کپتان نے کہا "یہ کوئی بیماری نہیں ہے۔ وہ بہت

جلد اچھا ہو جائے گا۔"

پھر کپتان نے ابو صیر کو خوب اچھی طرح کھانا کھلایا، اور جب وہ کھانے کے بعد جانے لگا تو اسے ایک بہت بڑی پلیٹ بھر کر دی اور کہا کہ "یہ کھانا تمہارے دوست کے لیے ہے۔"

یہ کھانا لے کر ابو صیر اپنے دوست کے پاس آیا اور بولا ــــ "میں نے تم سے کہا تھا کہ کپتان کے یہاں کھانے چلو لیکن تم نے معمولی کھانا کھایا۔ خیر کوئی بات نہیں ہے۔ کپتان نے تمہارے لیے بھیڑ کے کباب بھیجے ہیں۔"

اس پلیٹ کو دیکھتے ہی ابو قیر کبابوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس نے جلدی جلدی ندیدے آدمی کی طرح کھانا شروع کر دیا۔ جب کباب ختم ہو گئے تو پھر اس نے باقی چیزیں ذرا سی دیر میں ہڑپ کر ڈالیں اور زبان سے پلیٹ صاف کر کے ابو صیر کے حوالے کر دی۔

اب تو ابو صیر کا یہ طریقہ تھا کہ وہ دن بھر مسافروں کے بال بناتا اور رات کو کپتان کے ساتھ کھانا کھاتا ــــ مسافروں سے جو کچھ ملتا، اسے ابو قیر صاف کر ڈالتا۔ رات کو ابو صیر کپتان کے پاس سے جو کچھ لاتا، اسے بھی چٹ کر جاتا، اور ہر وقت اپنے بستر پر پڑا اینڈتا رہتا۔ آخر اکیس روز کے سفر کے بعد جہاز کسی شہر کے ساحل پر آ لگا ــــ ابو قیر اور ابو صیر دونوں کپتان سے

رخصت ہوئے اور جہاز سے اُتر کر شہر میں داخل ہوئے۔ شہر میں جاکر انھوں نے سرائے میں ایک کمرہ لیا۔ اور دونوں مزے میں رہنے لگے۔

ایکدن ابو قیر نے کہا" میری تو طبیعت خراب ہے۔ میں ابھی کوئی کام نہیں کر سکتا۔ البتہ تم زرا اپنے لیے کام ڈھونڈو۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں کے لوگ تمہاری حجامت کو بہت پسند کریں گے۔"

چنانچہ ابو صیر اپنا سامان لے کر نکل پڑا۔ وہ دن بھر شہر میں گھوما۔ اس نے بہت سے لوگوں کے بال بنائے۔ اس کا کام خوب چل نکلا اور چند روز کے اندر اس کے کام کی شہرت ہر طرف پھیل گئی۔ اب تو وہ طرح طرح کے کھانے لے کر آتا جیسے ہی کھانا آتا، ابو قیر اس پر ٹوٹ پڑتا۔ زرا سی دیر میں سب کھا پی کر برابر کر دیتا۔ اس طرح چالیس دن گزر گئے۔ ابو صیر حجّام تمام دن کام کرتا اور روپیہ کماتا رہا۔ لیکن رنگساز بیماری کا بہانا کرکے گھر میں پڑا رہتا۔ بس صرف کھانے کے لیے اُٹھتا۔ لیکن ابو صیر اس کو کچھ نہ کہتا، اور اس کا بڑا خیال رکھتا۔

چالیس دن کے بعد ابو صیر بیمار ہو گیا۔ اب اس سے اُٹھا بھی نہ جاتا۔ اس نے سرائے کے مالک سے کہا" میرے بھائی جب تک میں بیمار ہوں، میرے دوست کے لیے کھانا لا دیا کرو۔ میں اس کی قیمت تم کو دے دوں گا۔ چندروز

کے بعد ابو صیر کی حالت اور خراب ہو گئی۔ وہ اتنا کمزور ہو گیا کہ مُردے کی طرح پڑا رہتا۔ ادھر ابو قیر نے یہ حرکت کی کہ جب ابوصیر بیمار پڑا تھا اور سو رہا تھا تو اس نے سارے کمرے کی تلاشی لی اور اسے وہاں جو روپے پیسے ملے، اسے لے کر چپ چاپ باہر نکل گیا اور باہر سے اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اس وقت چوکیدار کہیں گیا تھا اس لیے اس نے ابو قیر کو باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ابو قیر نے باہر نکل کر پہلا کام یہ کیا کہ نان بائی کی دکان میں جاکر خوب ڈٹ کر کھانا کھایا، اور اس کے بعد مزے میں شربت پیا۔ اس کو پیسے کی طرف سے تو کوئی فکر نہ تھی کیونکہ اس نے ابوصیر کے تمام روپے چُرا لیے تھے۔

جب وہ کھانا کھا کر نکلا تو اسے خیال آیا کہ اس کے کپڑے بہت خراب ہیں۔ اس لیے اپنے لیے بہترین کپڑے خریدے اور انھیں پہن کر سارے شہر کی سیر کی۔ ایک بات جو اُسے خاص طور پر نظر آئی وہ یہ تھی کہ شہر بھر میں اُسے ایک آدمی بھی ایسا نظر نہ آیا جو نیلے یا سفید کے علاوہ کسی اور رنگ کے کپڑے پہنے ہو۔ کیا عورتیں کیا مرد سب ایک ہی رنگ کے کپڑے پہنے نظر آتے۔ ابو قیر کو اس بات پر بڑی حیرت ہوئی۔ یہ تو کپڑوں کی بات تھی۔ وہاں

تو یہ حال تھا کہ شربت بھی نظر آتا تو وہ بھی نیلا، خوشبوئیں نظر آئیں تو وہ بھی نیلی ـــــ غرض جس دُکان میں جائے، نیلے کے علاوہ کوئی اور رنگ نظر نہ آتا۔ اس نے سوچا کہ رنگساز کی دُکان پر چلنا چاہیے چنانچہ وہ رنگساز کے یہاں گیا تو اس کی ناند میں نیلا رنگ گھلا ہوا تھا اس نے اپنی جیب سے ایک رومال نکالا اور بولا ـــــ "میرے بھائی! یہ بتاؤ کہ تم اس رومال رنگنے کے کتنے پیسے لوگے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بتاؤ کہ کس رنگ میں رنگوگے۔"

اس رنگساز نے کہا ـــــ "میں اس کے بیس درم لوں گا اور اسی نیلے رنگ میں رنگوں گا۔"

ابو قیر نے کہا "واہ ایک رومال کے بیس درم اور وہ بھی نیلا رنگ رنگنے کے۔ اس کو تو زیادہ سے زیادہ ہمارے شہر کے حساب سے دو درم ہوئے۔"

رنگساز نے کہا "اگر یہ بات ہے تو بھائی تم اپنے شہر میں جاکر ہی اسے دو درم میں رنگواؤ یہاں تو بیس درم ہوں گے۔"

ابو قیر نے کہا "اچھا تو خیر چلو میں بیس درم ہی دوں گا مگر نیلے کے بجائے لال رنگ میں رنگواؤں گا۔"

رنگساز نے کہا ـــــ "لال سے تمہارا کیا مطلب ہے، لال تو کوئی رنگ نہیں ہے۔"

ابو قیر نے کہا ـــــ "اچھا لال نہیں رنگ سکتے تو

ہرا رنگ دو۔"

"ہرا بھی کوئی رنگ نہیں ہے۔" رنگساز نے کہا۔

"تو پھر زرد رنگ سے رنگ دو۔"

رنگساز نے اس سے بھی انکار کیا تب تو ابو قیر کی حیرت اور بڑھ گئی۔ اس نے ایک ایک کرکے بہت سے رنگ گنائے۔ لیکن ہر بار رنگساز نے یہی کہا" یہ بھی کوئی رنگ نہیں ہے۔" اور آخر میں بولا ——"بس یہ نیلا ہے۔"

اب تو ابو قیر کو یقین ہو گیا کہ یہ رنگساز، اور رنگوں کے بارے میں نہیں جانتا۔ اس لیے اس نے پوچھا ——"کیا تمہارے شہر کے دوسرے رنگساز بھی نہیں جانتے کہ کوئی اور رنگ بھی ہوتا ہے۔"

رنگساز نے کہا" یہاں اس شہر میں کُل مِلا کر چالیس رنگساز ہیں۔ ہم نے اپنی ایک انجمن بنالی ہے۔ ہمارے علاوہ کوئی اور آدمی اس کام کو نہیں کر سکتا۔ رنگنے کا کام تو ایسا ہے کہ ہم میں سے کوئی کسی کو نہیں سکھاتا۔ یہ ہمارا خاندانی پیشہ ہے۔ یہ کام ہمارے باپ دادا سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ اور ہم نے نیلے رنگ کے علاوہ کسی اور رنگ کا نام نہیں سُنا۔"

جب ابو قیر نے یہ سُنا تو اس نے کہا" ارے بھائی میں بھی رنگساز ہوں۔ میں تو طرح طرح کے رنگوں سے کپڑے

رنگ سکتا ہوں۔ اگر تم مجھے اپنی دُکان میں نوکر رکھ لو تو میں تم کو سارے طریقے بتا دوں گا اور تمہارے یہاں رنگ برنگے کپڑے رنگوں گا۔" اس رنگ ساز نے جواب دیا کہ "ہمارے یہاں پردیسیوں کو نوکر رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔"

ابو قیر نے کہا "اگر میں اپنے پیسے سے خود اپنی دُکان کھولوں گا تو کیسا رہے گا؟"

رنگساز نے کہا "یہ ناممکن ہے۔ بھلا تم کو کون دُکان کھولنے دے گا؟"

یہ سُن کر ابو قیر وہاں سے آگے بڑھا اور ایک اور رنگساز کی دُکان میں داخل ہوا، اس کے بعد تیسری دُکان میں۔ غرض اس نے شہر کے تمام رنگسازوں کی دُکانیں دیکھ ڈالیں۔ لیکن ہر جگہ اس کو وہی جواب ملا۔ کوئی بھی اس کو نہ تو کام دینے کے لیے تیار ہوا اور نہ اسے کسی نے یہ اجازت دی کہ وہ اپنی دُکان ہی کھول لے۔ آخرکار وہ رنگسازوں کی انجمن کے سکریٹری کے پاس گیا۔ اس نے کہا ——— "بھائی پردیسی! معاف کرنا۔ ہمارے یہاں کا قانون ہی کچھ ایسا ہے۔ تم کو نہ تو کوئی رنگساز نوکر رکھ سکتا ہے اور نہ تم کو دُکان کھولنے کی اجازت مل سکتی ہے۔"

ابو قیر کو یہ سُن کر بہت غصہ آیا اور وہ سیدھے بادشاہ کے محل میں پہنچا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا ——— "جہاں پناہ! میں پردیسی ہوں اور

اپنے دیس میں رنگساز کا کام کرتا تھا ـــــ میں الگ الگ چالیس رنگوں میں کپڑے رنگ سکتا ہوں ـــــ لیکن آپ کے یہاں کے رنگساز نہ تو مجھے اپنے یہاں کام کرنے دیتے ہیں اور نہ اس کی اجازت دیتے ہیں کہ میں اپنی ایک دُکان کھولوں۔ آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ دنیا میں طرح طرح کے رنگ ہوتے ہیں کوئی ہلکا، کوئی گہرا ـــــ اس طرح سنہرا، زرد، گلابی، ہرا، سُرخ ـــــ غرض کون سا رنگ ہے جس میں، میں کپڑے نہ رنگ سکوں۔"

جیسے ہی بادشاہ نے اتنے بہت سے رنگوں کے بارے میں سُنا، وہ اُچھل پڑا، کیونکہ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ بس لے دے کر یہی ایک نیلا رنگ ہوتا ہے۔ اس نے خوش ہو کر ابو قیر سے کہا۔" اگر تم واقعی سچ کہہ رہے ہو کہ اتنے بہت سے رنگ ہوتے ہیں اور تم رنگ برنگے کپڑے رنگ سکتے ہو تو تم کو پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میں نہ صرف تم کو دُکان کھولنے کی اجازت دوں گا بلکہ شاہی خزانے سے تم کو اتنے روپے پیسے دلواؤں گا کہ تم بہت شاندار دُکان کھول سکوگے۔ اور اگر تم کو کوئی روکے گا تو اسے سخت سزا ملے گی"ـــــ یہ کہہ کر بادشاہ نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ" اس آدمی کے ساتھ جاؤ اور اس کو اپنے سارے شہر میں گھماؤ، اسے جو دُکان پسند آئے دلوادو، چاہے وہ دُکان کسی کی بھی ہو۔ اس دُکان میں اس

کے کہنے کے مطابق رنگسازی کا سارا سامان لگا دو۔۔۔۔
اس کے علاوہ اس کے ساتھ کام کرنے کے لیے چالیس
غلام دے دو تاکہ یہ اپنا کام اچھی طرح کر سکے۔ اور یاد
رکھو اگر کوئی میرے حکم کو نہ مانے گا اور اس رنگساز کو
تکلیف پہنچائے گا تو اسے سخت سے سخت سزا دی جائے گی۔"

اس کے بعد بادشاہ نے ابو قیر کو بڑا قیمتی لباس دیا،
اور اس کو ایک ہزار درم کی تھیلی انعام کے طور پر دی اور کہا
کہ "جب تک تمہارا کام نہ چلے، اس ہزار درم سے اپنا کام
چلاؤ۔" یہی نہیں بلکہ اس نے اس کے رہنے کے لیے ایک
بڑا شاندار مکان اور چند غلام گھر کا کام کرنے کے لیے دیے،
اور شاہی اصطبل سے ایک گھوڑا دیا۔

اگلے دن اس گھوڑے پر سوار ہو کر ابو قیر بڑی شان
سے دُکان دیکھنے کے لیے نکلا۔ بادشاہ کے آدمی اس کے
ساتھ ساتھ تھے اور جو کوئی اسے دیکھتا یہی سمجھتا کہ کوئی
بڑا آدمی آرہا ہے۔۔۔۔ جب بازار کے بیچوں بیچ پہنچا تو
اسے ایک بہت بڑی دُکان نظر آئی۔ اس نے کہا "بس یہ
دُکان ٹھیک ہے۔ میرے لیے یہ دُکان خالی کرادو۔"

اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ شاہی ملازموں
نے فوراً اس دُکان کے مالک کو دُکان کے باہر کھڑا کر دیا
اور اس کا سارا سامان نکال کر باہر پھینک دیا۔ وہ بیچارا
کرتا بھی تو کیا کرتا اس لیے کہ بادشاہ کے حکم کو کون ٹال

سکتا تھا۔ اب ابو قیر نے باہر کھڑے ہو کر حکم دینا شروع کر دیا ــــ "یہ لاؤ ــــ وہ لاؤ ــــ یہاں رکھو ــــ وہاں رکھو ــــ" غرض دن بھر میں دُکان سج گئی۔

جب باقاعدہ دُکان لگ گئی تو ابو قیر نے بادشاہ کو خبر دی کہ "اب ہمارا کام تیار ہے اور کل سے ہمارا کاروبار شروع ہو جائے گا۔" بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس نے ابو قیر سے کہا کہ "تم اپنا کام اچھے سے اچھا کرو اور روپے کی طرف سے بالکل فکر مت کرو، جتنے روپے کی ضرورت ہوگی، تم کو خزانے سے مل جائے گا، لیکن میں چاہتا ہوں کہ جیسا تم کہتے ہو ویسے ہی رنگ برنگے کپڑے رنگو۔"

بادشاہ نے ابو قیر کو اپنے بہترین کپڑے رنگنے کے لیے بھجوائے۔ ان میں سوتی بھی تھے اور ریشمی اور اونی بھی۔ ابو قیر نے انھیں مختلف رنگوں میں رنگنے کے بعد سڑک کے کنارے سوکھنے کے لیے ڈور میں لگا دیا۔ یہ ڈور اس نے خاص طور پر دُکان کے سامنے لگا دی تھی جہاں دھوپ بھی آتی تھی اور ہوا بھی ــــ جیسے ہی یہ کپڑے دُکان کے سامنے لگے تو وہاں اُنھیں دیکھنے کے لیے بھیڑ اکٹھا ہو گئی ــــ یہاں کے لوگوں نے اس سے پہلے اتنے رنگ کہاں دیکھے تھے۔ وہ تو صرف نیلا رنگ دیکھنے کے عادی تھے۔ ہر طرف شور مچ گیا کہ بادشاہ کے رنگساز نے بڑے

خوبصورت رنگوں میں کپڑے رنگے ہیں۔ ہر ایک جوق در جوق انھیں دیکھنے کے لیے آرہا تھا۔ دُکاندار اپنی دُکانیں بند کر کے آرہے تھے۔ عورتیں اور بچے اپنے اپنے گھروں سے نکل کر آرہے تھے۔ بازار میں ایک دھوم سی مچی ہوئی تھی۔ ہر ایک کی زبان پر رنگساز کا نام تھا۔ پھر ابو قیر لوگوں کو رنگوں کے نام بتاتا ــــــ کسی سے کہتا یہ عنابی ہے۔ کسی کا سُرخ۔ کسی کا چمپئی، کسی کا بادامی، کسی کا سُرمئی اور کسی کا ہرا ــــــ غرض وہ ایک ایک رنگ کو دکھا کر اس کا نام بتاتا۔ لوگ حیرت سے ان رنگوں کو دیکھ رہے تھے۔

ابھی لوگ یہ دیکھ رہے تھے کہ اچانک شور اُٹھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ بادشاہ سلامت کی سواری آرہی ہے آگے پیچھے خدمت گار تھے۔ بادشاہ کی سواری ابو قیر کی دُکان کے سامنے آکر رُک گئی۔ بادشاہ نے جو اتنے بہت سے رنگوں کے کپڑے رنگے دیکھے تو بہت خوش ہوا۔ بہت خوش ہوا۔ اس نے ایک ایک رنگ کو غور سے دیکھا۔ بادشاہ کے ساتھ جو لوگ تھے وہ بھی ابو قیر کی تعریف کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ گھوڑے بھی اتنے بہت سے رنگ دیکھ دیکھ کر جھوم رہے تھے۔

بادشاہ نے اپنے کپڑے لے لیے اور ابو قیر کو لے کر محل آیا۔ جب محل میں عورتوں نے اتنے رنگ برنگے لباس دیکھے تو بہت خوش ہوئیں اور انھوں نے جلدی جلدی ان کپڑوں سے اپنے لباس سلوائے۔ پھر بادشاہ نے ابو قیر کو

اور بہت سے کپڑے رنگنے کے لیے دیے۔ چند روز کے بعد
شاہی دربار کا ہر آدمی رنگ برنگے کپڑے پہنے نظر آرہا تھا۔ شہر
کا ہر آدمی چاہتا تھا کہ وہ اپنے کپڑے ابو قیر کی دکان سے
رنگوالے۔ ابو قیر کی دکان پر کپڑوں کا ڈھیر لگ گیا۔ چند روز
میں یہ نوبت آئی کہ ابو قیر بہت دولتمند ہو گیا۔ اس نے بہت
سا روپیہ کمایا۔ اب تو دوسرے رنگسازوں کی دکانوں پر سناٹا
چھا گیا۔ ان کی دکانوں پر کوئی نہ جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ
تمام دکاندار اور ان کی انجمن کے صدر اس کے پاس آئے
اور کہنے لگے "ارے بھائی! ہم کو اپنی دکان میں کام سکھانے
کے لیے رکھ لو۔ ہم تمھاری ہر طرح خدمت کریں گے۔"

ابو قیر نے ان لوگوں کو خوب ڈانٹا اور دکان سے باہر
نکال دیا۔ وہ بیچارے سر جھکائے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔
چند روز بعد تو یہ عالم ہو گیا کہ شہر میں جو کوئی نظر آتا وہ
ابو قیر کے رنگے ہوئے کپڑے پہنے ہوتا۔

اب ابو صیر کا حال سنیئے۔ جب رنگساز اُسے سرائے میں
بیمار چھوڑ کر چلا آیا تو وہ تین دن اور تین رات اسی طرح پڑا
رہا۔ سرائے کے چوکیدار نے جو اس طرح دروازہ بند دیکھا اور
یہ دیکھا کہ نہ کوئی اندر جاتا ہے اور نہ باہر آتا ہے تو پہلے وہ
یہی سمجھا کہ شاید دونوں چپ چاپ کرایہ ادا کیے بغیر وہاں
سے سرک گئے یا پھر کوئی حادثہ پیش آیا۔ اس نے جو دروازہ
کھولا تو کیا دیکھتا ہے کہ حجام بالکل بے دم پڑا ہے۔ اس

نے حجام سے پوچھا۔ "میرے بھائی بتاؤ تمہارا کیا حال ہے؟ کیا تکلیف ہے؟ اور ہاں تمہارا دوست کہاں ہے؟ مجھے بھی وہ کئی دن سے دکھائی نہیں دیا۔"

حجام نے کہا" اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ مجھے تو خود کئی روز سے اپنی خبر نہیں ہے۔ اس وقت بس ذرا سا ہوش آیا ہے۔ مجھے بڑی بھوک پیاس لگ رہی ہے۔ میرے پیسے ادھر تھیلی میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس میں سے لے کر میرے لیے کھانے پینے کے لیے کچھ لادو، جس سے بدن میں کچھ طاقت آئے۔"

چوکیدار نے کمرے میں ہر طرف وہ تھیلی تلاش کی۔ مگر جب کہیں نہ ملی تو وہ سمجھ گیا کہ ضرور یہ حجام کے دوست کی حرکت ہے۔ وہی اسے لے کر غائب ہو گیا ہے۔ اس نے ابو صیر سے کہا ——— پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہر ایک کی اچھائی، نیکی اور برائی کو خدا دیکھتا ہے۔ اب میں خود تمہاری دیکھ بھال کروں گا۔"

اس نے جلدی جلدی شوربا پکایا اور حجام کو اُٹھاکر اپنے ہاتھوں سے پلایا۔ اور پھر اسے کپڑے اوڑھا کر اچھی طرح لٹا دیا۔ اس طرح چوکیدار نے ابو صیر کی دو مہینے تک بڑی محنت اور ذمّہ داری سے دیکھ بھال کی، دوا علاج کیا۔ تب جاکر وہ ٹھیک ہوا اور چلنے پھرنے کے قابل ہوا۔ وہ چوکیدار سے بولا ——— "جب بھی اللہ

نے مجھے اس قابل کیا، میں تمہاری اس نیکی کا بدلہ چکانے کی کوشش کروں گا۔ تم نے اس بیماری میں جس طرح میری دیکھ بھال کی، میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔"

چوکیدار نے کہا "تم بالکل فکر مت کرو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو اس قابل کیا کہ تم چل پھر سکو۔ یہ سب کچھ اللہ کی مہربانی ہے۔"

اب ابوصیر نے اپنی حجامت کا سامان اُٹھایا اور اس نے سوچا کہ اپنے کام پر نکلنا چاہیے۔ جب وہ شہر کی سڑکوں پر کام کی تلاش میں گھوم پھر رہا تھا تو اسے بیچوں بیچ چوراہے پر ابوقیر کی دُکان نظر آئی۔ وہاں بہت بھیڑ تھی جو رنگے ہوئے کپڑوں کو دیکھنے کے لیے وہاں جمع تھی۔ ابوصیر نے لوگوں سے پوچھا —— "یہاں کیسی بھیڑ ہے؟"

ایک آدمی نے جواب دیا۔ "تم کو نہیں معلوم —— اسے بھائی یہ شاہی رنگساز ابوقیر کی دُکان ہے۔ یہی تو وہ شخص ہے کہ جو نہ جانے کتنے رنگوں میں کپڑے رنگتا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے تو ہم صرف ایک نیلا رنگ ہی جانتے تھے۔ تم بھی دیکھو۔"

یہ سُن کر ابوصیر بہت خوش ہوا۔ آخرکار اس کے دوست کی قسمت چمک ہی گئی۔ اس نے بلا وجہ اس کے اوپر شک کیا۔ دراصل وہ اسی کام کی وجہ سے اس کو چھوڑ کر چلا آیا ہوگا۔ اور اب بیچارے کو کام کی وجہ سے فرصت

نہ ملتی ہوگی۔ ورنہ ضرور وہ میرے پاس آتا۔ غالبًا اس نے میری تھیلی اس لیے اُٹھائی تھی کہ اسے اپنے کاروبار میں روپیہ کی ضرورت ہوگی ——— ابوصیر یہ سوچ سوچ کر اور خوش ہو رہا تھا کہ اب ابوقیر میری مدد کرے گا ——— اور مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔

یہ سوچ کر وہ بڑی تیزی سے بھیڑ کو چیرتا ہوا دُکان کے اندر داخل ہوا۔ دیکھتا کیا ہے کہ سامنے ایک تخت پر قالین بچھا ہوا ہے اور پیچھے تکیے لگے ہیں اور ابوقیر اس پر شاندار لباس پہنے ٹانگ پھیلائے لیٹا ہوا ہے، اور دونوں طرف چار چار خدمت گار کھڑے ہیں اور اندر دس بارہ آدمی رنگائی کا کام کر رہے ہیں۔ ابوصیر تھوڑی دیر چُپ چاپ کھڑا مُسکراتا رہا۔ اس نے سوچا کہ ابوقیر کی نظر خود ہی پڑے گی تو بڑا مزا آئے گا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ننگے پاؤں دوڑ پڑے گا اور مجھ سے لپٹ جائے گا۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ابوقیر کی نظر اس پر پڑی۔ اس نے جیسے ہی ابوصیر کو دیکھا چیخ پڑا " ابے چور کہیں کے۔ تجھ سے کتنی مرتبہ کہا کہ میری دُکان میں قدم مت رکھنا۔ تو پھر آگیا اپنی منحوس صورت لے کر۔ ارے کوئی ہے؟ اسے لے جاؤ اور اسے دھکا دے کر دُکان سے باہر نکال دو۔"

جیسے ہی اس نے کہا ——— اس کے آدمیوں نے دھکا

دے کر ابو صیر کو نکال دیا۔ پھر ابو قیر چھڑی لے کر اس پر پل پڑا اور اسے اتنا پیٹا کہ اس کی حالت خراب ہو گئی۔ ابو قیر نے اسے زور سے ڈانٹا "اب اگر پھر میں نے تم کو یہاں دیکھا تو بادشاہ کے سپرد کر دوں گا جو تم کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دے گا ——— بس تیری خیر اسی میں ہے کہ یہاں سے نکل جا اور اپنی صورت مت دکھانا"

بیچارا نائی مار کھا کر وہاں سے نکلا۔ اتنی بڑی دھوکے بازی ——— وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ وہ روتا ہوا چلا جارہا تھا اور بچے اس کے پیچھے پیچھے تالیاں بجا رہے تھے۔ اسی طرح وہ سرائے میں داخل ہوا اور اپنے کمرے میں جاکر لیٹ گیا۔ اس کے بدن میں زخموں کی وجہ سے سخت درد تھا۔ لیکن اس سے زیادہ اس کو اس بات کی تکلیف تھی کہ اس کے دوست نے اسے دھوکا دیا ہے۔ اس طرح اس نے ساری رات کروٹیں لے لے کر گزاری۔ جب صبح کو وہ اٹھا تو وہ سرائے کے باہر نکلا۔ باہر نکل کر اس نے سوچا کہ حمام میں جاکر اُسے غسل کرنا چاہیے تاکہ بدن پر جما ہوا خون دُھل جائے۔ ادھر ایک بات یہ تھی کہ بیماری سے اچھا ہونے کے بعد وہ نہایا بھی نہ تھا۔ اس نے ایک راہگیر سے پوچھا ——— "میرے بھائی مجھے حمام کا راستہ بتادو"

اس آدمی نے کہا ——— "حمام! کیسا حمام؟ ہم نے

تو حمام کا نام کبھی نہیں سنا۔"

ابو صیر حجام نے کہا "ارے بھائی حمام ــــ وہی حمام جہاں ہم غسل کرتے ہیں۔ شہر کے تمام لوگ جہاں جاکر نہاتے ہیں ـــــــ میں بھی اس وقت حمام میں نہانا چاہتا ہوں۔"

اس آدمی نے کہا ـــــ "ہم لوگ نہیں جانتے کہ حمام کسے کہتے ہیں۔ جہاں تک نہانے کا تعلق ہے، سب لوگ سمندر کے کنارے جاکر نہاتے ہیں یہاں تک کہ ہمارے شہر کا بادشاہ بھی سمندر کے پانی سے نہاتا ہے۔"

جب ابو صیر کو یہ بات معلوم ہوئی کہ واقعی یہاں شہر کے لوگ حمام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو وہ سیدھا بادشاہ کے محل پر پہنچا اور اس نے دربان سے کہا "میں بادشاہ سے ایک بہت ضروری کام کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہوں۔"

ذرا سی دیر میں ایک آدمی نکلا اور اسے بادشاہ کی خدمت میں لے گیا۔ ابو صیر نے پہلے تو بادشاہ کو بڑے ادب سے جھک کر سلام کیا، اور اس کے بعد بولا ـــــ "جہاں پناہ! میں آپ کے شہر میں ایک اجنبی ہوں۔ میرا پیشہ حجام کا ہے۔ لیکن میں اس کے ساتھ ساتھ اور کاموں سے بھی واقف ہوں۔ مثلاً حمام کے سارے کام کر سکتا ہوں۔ جیسے حمام کے لیے پانی بھرنا ـــــ اس کے لیے

خوشبو تیار کرنا ــــــ اور نہانے کے لیے بدن کی مالش کرنا ــــــ حالانکہ ہمارے ملک میں یہ کام مختلف لوگ کرتے ہیں اور وہ لوگ زندگی بھر یہی کام کرتے رہتے ہیں۔ آج میں چاہتا تھا کہ آپ کے شہر کے حمام میں جاکر نہاؤں۔ تب میں نے لوگوں سے پوچھا ــــــ یہاں کا حمام کہاں ہے۔ لیکن جہاں پناہ! مجھے یہ سُن کر سخت حیرت ہوئی کہ آپ کے شہر کے لوگ حمام کے لفظ سے بھی واقف نہیں۔ آپ کا شہر اتنا اچھا اور خوبصورت ہے کہ یہاں حمام کا انتظام ہو جائے تو پھر یہاں چار چاند لگ جائیں۔ سچ ہے کہ نہانے کا اصل مزا تو حمام ہی میں آتا ہے۔ اور جب آدمی حمام سے نکل کر باہر آتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جسم کتنا تر و تازہ ہے۔"

بادشاہ نے جب سُنا تو بولا" ارے بھائی یہ تو بتاؤ کہ حمام کیا ہوتا ہے؟ ــــــ ہم نے تو تمہاری زبان سے پہلی بار ہی یہ لفظ سُنا ہے۔"

ابو صیر نے پھر بادشاہ کو بتایا کہ حمام کیسے بنتا ہے اندر کیا کیا ہوتا ہے۔ اس کو گرم رکھنے کا کیسے انتظام کیا جاتا ہے، اور پھر کیسے وہاں لوگوں کے جسم میں مالش کی جاتی ہے اور انھیں نہلایا جاتا ہے۔ پھر اس نے کہا" جہاں پناہ! میں الفاظ کے ذریعے محض زبان سے حمام کی اہمیت اور اس کی حقیقت کے بارے میں اور کچھ نہیں سمجھا سکتا ــــــ

اس لیے کہ اسے تو صرف دیکھ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ البتہ میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کا شہر حمام کھل جانے کے بعد ہی ایک شاندار شہر کہلا سکتا ہے۔"

یہ سن کر بادشاہ بہت خوش ہوا اور بولا "مجھے تمہاری باتوں سے اطمینان ہوا۔ میں اپنے شہر میں تمہارا استقبال کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے حکم دیا کہ جتنی جلد ہو سکے فوراً حمام بناؤ۔ تم نے جو حمام کے بارے میں باتیں بتائی ہیں اس کے بعد تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں جلد از جلد اس میں نہانے کا لطف اٹھاؤں۔"

بادشاہ اتنا خوش ہوا اتنا خوش ہوا کہ اس نے ابو صیر کو بہت انعام و اکرام دیے۔ ایک گھوڑا دیا۔ بہت سے نوکر چاکر دیے۔ اس کے رہنے کے لیے ایک شاندار مکان دیا۔ اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ابو صیر کو جو جگہ پسند آئے وہاں اس کے کہنے کے مطابق فوراً عمارت بنادی جائے اور اس کے بنانے میں جتنے خرچ کی ضرورت ہو وہ خزانے سے لیا جائے۔"

ابو صیر حجام نے گھوڑے پر بیٹھ کر نوکروں کے ساتھ سارے شہر کی سیر کی۔ آخر اس کو ایک خالی جگہ پسند آگئی۔ اس نے حکم دیا کہ یہاں پر حمام بنایا جائے۔ اس کے بعد ابو صیر کی ہدایت کے مطابق نقشہ تیار کیا گیا اور چند روز کے اندر بہت سے کاریگروں نے

مِل کر اس کی ہدایت کے مطابق عمارت بنا کر کھڑی کر دی۔
اس کے بعد ابو صیر نے اس کو بہت خوبصورت طریقے
سے سجایا۔ اس میں رنگ برنگے فیتے لگائے۔ نہانے
کی جگہ کو بہت آرام دہ بنایا۔ اس نے بہترین قسم کے
تولیوں کا انتظام کیا۔ بہترین خوشبوئیں حاصل کیں اور
جسم کی صفائی کے لیے اور بہت سے مسالے تیار کیے۔
غرض دیکھتے دیکھتے یہ ایک ایسا شاندار حمّام بن کر تیار ہو
گیا کہ اس کی مثال مشکل ہی سے مِل سکتی ہے۔ اس کے
بعد اُس نے چند نوکروں کو جسم پر مالش کرنے کے
طریقے سکھائے۔ اس نے خود اپنے جسم پر مالش کرا کے
چند روز کے اندر اندر ان کو اس کام میں اچھا خاصا ماہر
کر دیا۔ اب اس نے حمّام کے باقاعدہ کھُلنے کا اعلان کر دیا۔
اس دن حمام بہت اچھی طرح گرم کیا گیا۔ وہاں طرح
طرح کی خوشبوئیں جلائی گئیں تاکہ ہوا صاف ہو اور حمّام
کے اندر ہر طرف خوشبو پھیل جائے۔ حمّام کے صحن میں
اس نے ایک فوّارہ لگوایا تھا۔ اس سے جب پانی گرتا
تھا تو اس سے اتنی اچھی آواز پیدا ہوتی تھی جیسے کوئی
باجا بجا رہا ہو۔
پہلے روز ابو صیر نے اتنا اہتمام کیا کہ حمّام کی شان بس
دیکھنے کے لائق تھی۔ ابو صیر نے بادشاہ کو پہلے ہی دعوت
دے دی تھی۔ جیسے ہی وہ حمّام میں اپنے وزیروں اور

درباریوں کے ساتھ داخل ہوا، اس کو ایسا لگا، جیسے وہ جنت میں داخل ہو گیا ہے۔ اس کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ سجاوٹ کو دیکھ کر تو اس کی آنکھوں میں چکا چوند سی ہو گئی۔ جب اس کی ناک میں خوشبو پہنچی تو اسے ایسا لگا کہ سارا دماغ مہکنے لگا ——— اور اس کے کانوں میں فوّارے کی آواز ایسی معلوم ہوئی جیسے کوئی دھیمے سروں میں باجا بجا رہا ہو۔

اس کے بعد ابو صیر نے کہا۔" اگر بادشاہ سلامت مناسب سمجھیں تو میری خواہش ہے کہ بادشاہ سلامت پہلے غسل کریں۔ اس کے بعد پھر وزیروں اور امیروں کی باری آئے گی۔"

اب بادشاہ کو اندر لے گئے۔ وہاں ان کے کپڑے اتار کر ان کے جسم کو تولیوں میں لپیٹا گیا پھر اور دوسرے کمرے میں لے گئے جو زیادہ گرم تھا۔ بادشاہ کے جسم سے پسینہ نکلا۔ ابو صیر اور اس کے نوکروں نے پھر ایک تیسرے کمرے میں لے جا کر خوب اچھی طرح بادشاہ کے جسم کا پسینہ پونچھا۔ جب جسم کا پسینہ خوب اچھی طرح خشک ہو گیا تب ابو صیر نے مالش کی۔ جب بادشاہ کے جسم کی مالش ہو چکی تو اس کے بعد گرم پانی سے نہلایا گیا۔ اس موقع پر ابو صیر نے بہترین مسالوں اور صابنوں سے ان کے جسم کو صاف کیا۔ چنانچہ اس طرح نہلانے سے اُن کے جسم کا میل بھی نکل گیا اور ان کی کھال پھر نرم ہو گئی اور

بادشاہ سلامت کو اپنا بدن بڑا ہلکا ہلکا سا لگا۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ سلامت اس سے پہلے کہاں اس طرح نہاتے ہوں گے۔ اس کے بعد بادشاہ کو گلاب کے پانی سے ایک بار پھر غسل کرایا گیا۔ ان کے ناخن صاف کیے گئے اور آخر میں ابو صیر نے خود اپنے ہاتھ سے مختلف مسالوں سے بادشاہ کا سر دھویا اور اس کا میل صاف کیا۔

اس کے بعد بادشاہ کو دوسرے کمرے میں لے گئے۔ یہ کمرا بہترین قسم کی خوشبوؤں اور عطروں سے بسا ہوا تھا۔ وہاں بادشاہ کے جسم کو تولیے سے خوب اچھی طرح خشک کیا گیا۔ اور پھر ایک نیا شاہی لباس بڑے اہتمام کے ساتھ پہنایا گیا۔ بادشاہ کو ایسا لگا کہ جیسے اس کا جسم ہلکا ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو خوب ترو تازہ محسوس کیا۔ ایسا لگا کہ برسوں کی گندگی دور ہو گئی۔ اس کے بعد تو گویا اس کے بدن میں نئی طاقت سی آگئی اور بے ساختہ اس نے کہا "اے میرے خدا تیرا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج ابو صیر حجام کی بدولت مجھے حمام کے دیکھنے اور یہاں نہانے کا موقع ملا۔ ابو صیر حجام نے سچ کہا تھا کہ واقعی بغیر حمام کے کوئی شہر شاندار نہیں کہلایا جا سکتا۔" یہ کہہ کر بادشاہ نے اسی وقت ایک ہزار دینار ابو صیر کو انعام کے طور پر دیے۔ اس کے بعد ابو صیر نے بادشاہ کو ایک الگ کمرے میں ناشتہ کرایا اور میووں کا بہترین شربت پلایا۔

بادشاہ نے کہا" تم ہر ایک سے نہانے کی قیمت ہزار دینار لینا۔"

ابو صیر نے کہا " جہاں پناہ! آپ تو بادشاہ ہیں لیکن آپ کی رعایا میں امیر بھی ہیں اور غریب بھی ہیں ــــ میں چاہتا ہوں کہ اس حمام کے ذریعے ہر ایک آدمی کی خدمت کروں۔ اس لیے میں آپ سے اتنی اجازت چاہتا ہوں کہ اس کی کوئی قیمت نہ مقرر کی جائے۔ جو شخص بھی اپنے حالات کے مطابق جتنا دے سکے، میں اسے ہنسی خوشی قبول کرنا چاہتا ہوں ــــ ہزار درہم تو بہت ہوتے ہیں اور یہ رقم تو انعام ہے جو مجھے حضور کی طرف سے ملے ہیں۔ میں اس انعام پر زندگی بھر فخر کروں گا۔"

وزیر اور امیر ابو صیر کی باتوں سے بہت خوش ہوئے اور انھوں نے کہا۔" بادشاہ سلامت! ابو صیر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بھلا سب کے پاس اتنی دولت کہاں ہے جو آپ کے پاس ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ابو صیر کی بات مان لی جائے۔"

بادشاہ نے کہا۔" ہاں میں ابو صیر کی بات مانتا ہوں۔ لیکن ابو صیر بہت معمولی آدمی ہے اور اس نے ہمارے شہر کے لیے حمام بنا کر بہت بڑا کام کیا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دن وزیروں اور امیروں کو تو سو سو دینار دینا چاہیے۔ اس کے بعد جس کا جو جی چاہے دے۔"

سب لوگوں کو یہ بات پسند آئی۔ اور اسی وقت سب

نہانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس روز ہر ایک نہایا اور اس
نے ابو صیر کو بادشاہ کے کہنے کے مطابق سو سو دینار دیے۔
اس روز بادشاہ کے ساتھ چالیس وزیر اور امیر آئے تھے اس
لیے ایک دن میں ہی ان سے چار ہزار دینار ملے۔ بادشاہ کے
ایک ہزار دینار اس کے علاوہ تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ابو صیر
کی خدمت کے لیے دس سفید غلام، دس حبشی غلام اور دس کنیزیں
بھی دیں بادشاہ نے پہلے بھی بے شمار غلام اور کنیزیں اس کو دی تھیں۔
جب ابو صیر کو اتنے بہت سے غلام اور کنیزیں اور ان
کے ساتھ ساتھ اتنی بہت سی دولت ملی تو اس نے بادشاہ
کے قدموں کو بوسہ دیا۔ "جہاں پناہ! آپ نے جو مجھے عزت
اور دولت دی اس کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا
ہوں لیکن میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ میں معمولی حیثیت
کا آدمی غلاموں کی فوج رکھ کر کیا کروں گا؟"
بادشاہ نے کہا: "میں نے یہ حکم اس لیے دیا کہ میں سوچ
رہا تھا کہ ایک دن جب تم اپنے ملک واپس جاؤ گے تو اتنی
دولت اور اتنے غلام لے کر جاؤ گے کہ پھر تم کو عمر بھر کچھ
کرنے کی ضرورت نہ ہوگی اور میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے ملک
میں بہت بڑے آدمیوں کی طرح زندگی گزارو تاکہ لوگ کہہ
سکیں کہ پردیس میں اس کا اتنا خیال رکھا گیا۔"
ابو صیر نے کہا: "بادشاہ سلامت! میں بہت معمولی
آدمی ہوں۔ یہ میرے لیے فخر کی بات ہے کہ آپ نے میری

اتنی عزت بڑھائی اور میرے کام کی اتنی زیادہ قدر کی۔ میں آپ کی یہ محبت اور قدر دانی کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں جب بھی اپنے ملک میں جاؤں گا تو اپنے وطن کے لوگوں کے ساتھ سیدھی سادی زندگی گزاروں گا اور معمولی کھانا کھاؤں گا۔ ایسی صورت میں میرے لیے کہاں تک مناسب ہے کہ میں غلاموں اور کنیزوں کو اپنے یہاں رکھوں۔ یہ لوگ میری ساری دولت کھا جائیں گے۔"

بادشاہ یہ سن کر بہت ہنسا اور بولا۔" واقعی تم سچ کہتے ہو۔ مجھے پہلے اس بات کا خیال نہیں آیا۔ اچھا اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ تم ان غلاموں اور کنیزوں کو سو دینار فی کس کے حساب سے میرے ہاتھ بیچ دو۔ اس کی قیمت شاہی خزانے سے ادا کردی جائے گی۔"

ابو صیر نے یہ تمام غلام اور کنیزیں بادشاہ کے حوالے کردیں۔ اب جو ان کو گنا گیا تو اُن کی تعداد کُل مِلاکر ڈیڑھ سو نکلی۔ بادشاہ نے ان کے بدلے میں ابو صیر کو پندرہ ہزار دینار شاہی خزانے سے دلوائے۔

اب تو ابو صیر بہت خوش ہوا۔ اس نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا کہ اِن کے کھلانے پلانے سے اس کی جان بچی ورنہ تو یہ غلام اس کی ساری دولت کھا پی کر برابر کر دیتے۔ بادشاہ اس بات کو سوچ سوچ کر بہت ہنسا۔ اب بادشاہ محل میں چلا گیا اور ابو صیر اپنے گھر واپس آیا۔ یہاں پہنچ

کر اس نے پہلا کام تو یہ کیا کہ اس نے اپنی دن بھر کی کمائی، اچھی طرح سے بوروں میں بند کرکے ایک کمرے میں رکھ دی۔

اگلے دن ابوصیر نے سارے شہر میں اعلان کردا دیا کہ "جو اللہ کا بندہ نہانا چاہے وہ مُفت نہا سکتا ہے۔ تین دن تک کسی سے کچھ نہ لیا جائے گا۔"

اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ تین دن حمّام میں بھیڑ لگی رہی۔ مفت نہانے کی وجہ سے، جس کو دیکھیے وہ بھاگا چلا آرہا ہے۔ ہر قسم کے آدمی نہانے آئے اور وہ نہاکر خوش خوش گھر گئے — چوتھے دن ابوصیر باقاعدہ اپنی گدّی پر بیٹھ گیا اور اب نہانے کے سلسلے میں اس نے یہی کیا کہ جو اس نے بادشاہ سے کہا تھا کہ ہر ایک اپنی حیثیت کے مطابق جو چاہے دے۔ لیکن اس کے باوجود لوگوں نے جی کھول کر اس کو روپیہ دیا کہ شام تک اس کا صندوق بھر گیا۔

ادھر ملکہ نے جب بادشاہ سے حمّام کی تعریف سُنی تو وہ بہت خوش ہوئی اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ "میں حمّام میں نہانا چاہتی ہوں۔ کیا میرے نہانے کا انتظام ہوسکتا ہے؟"

بادشاہ نے یہ پیام ابوصیر کو بھیجا۔ ابوصیر نے ملکہ کے نہانے کے لیے جمعہ کا دن مقرّر کردیا اور اس دن ملکہ کی خدمت عورتوں کے سپرد کردی۔

جمعہ کے دن جب ملکہ حمام میں آئیں تو وہ بڑے اہتمام سے نہائیں۔ ملکہ بہت خوش ہوئیں اور انھوں نے بھی بادشاہ کی طرح ایک ہزار دینار انعام کے طور پر دیے۔ اور اب ملکہ کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ ہر جمعہ کو حمام میں غسل کرنے آتیں۔ پھر ابو صیر نے یہ انتظام کر دیا کہ شام کے وقت صرف عورتیں حمام میں غسل کرتیں۔

اس طرح ابو صیر نے بہت روپیہ کمایا، بڑی عزت حاصل کی ـــــ لیکن اس کے مزاج، ملنے جلنے اور بات چیت کرنے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ لوگوں سے اسی محبت سے بات کرتا تھا۔ اس کے حمام میں غریبوں سے کچھ نہیں لیا جاتا تھا۔ وہ مفت میں نہاتے تھے۔ ایک روز ایک جہاز کا کپتان آیا۔ اس کے روپے کہیں گر گئے تھے۔ ابو صیر نے اس کے حمام میں غسل کرنے کا کوئی معاوضہ نہیں لیا اور اس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آیا۔ ابو صیر نے اسے کھانا کھلایا اور بہترین شربت پلایا۔

ایک روز ہوتے ہوتے یہ خبر ابو قیر رنگساز کو معلوم ہو گئی کہ شہر میں کوئی حمام کھلا ہے جسے دیکھو حمام کی تعریف کر رہا ہے۔ ابو قیر نے سوچا کہ وہ بھی وہاں جا کر نہائے۔ چنانچہ وہ بھی گھوڑے پر سوار ہو کر حمام پہنچا۔ اس کے آگے پیچھے غلام تھے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ حمام کے سامنے ایک بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ اس

کو دور ہی سے خوشبو آئی اور وہ بہت خوش ہوا۔
جیسے ہی وہ حمام میں داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کا دوست حجام سامنے بیٹھا ہوا ہے اور اس کے سامنے روپیوں کا ڈھیر ہے۔ پہلے تو اس کو پہچاننے میں ابو قیر کو دقت ہوئی اس لیے کہ ابو صیر کے گالوں کے گڑھے بھر گئے تھے اور وہ خوب تندرست ہو گیا تھا اور اس کو لباس اور صورت شکل کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اب وہ خوشحال زندگی گزار رہا ہے۔
ابو قیر اس کو دیکھ کر جل گیا لیکن اس نے چہرہ ایسا بنایا کہ جیسے بہت خوش ہوا ہو۔ اور ہنس کر بولا "اچھا تو دوست کے ساتھ یہ دوست کا سلوک ہے۔ تم کو تو یہ بات معلوم ہو گئی ہو گی کہ میں شاہی رنگساز ہو گیا ہوں اور میری گنتی شہر کے دولت مند لوگوں میں ہونے لگی ہے۔ اور تم پھر بھی کبھی مجھے دیکھنے نہیں آئے۔ تم کو کبھی یہ خیال نہیں ہوا کہ ہمارا دوست ابو قیر کس حال میں ہے۔ میں نے اپنے ملازموں کو سرائے میں تمہیں ڈھونڈنے کے لیے بھیجا مگر وہاں بھی تمہارا کچھ پتہ نہیں چلا —— اس کے بعد شہر بھر میں ڈھونڈا لیکن تمہارا کہیں کوئی نشان نہ ملا۔"
ابو صیر نے بہت اداس ہو کر کہا —— "اے ابو قیر تم بھول گئے کہ تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ تم نے اپنے نوکروں سے چور ڈاکو اور خدا جانے کیا کیا کہہ کر نکلوا دیا تھا۔

مجھے تمہارے آدمیوں نے دھکا دے کر زمین پر گرا دیا، اور اتنا مارا کہ میرے سارے جسم پر زخم ہو گئے۔"

ابو قیر نے بڑی حیرت سے کہا ـــــــ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو ـــــــ کیا تم ہی وہ آدمی تھے جس کو میں نے مارا تھا؟"

ابو صیر نے کہا۔ "جی ہاں وہ میں ہی تھا جس کو تم نے نہ صرف مارا تھا بلکہ چور ڈاکو اور خدا جانے کیا کیا کہا تھا۔"

ابو قیر نے کہا۔ "ارے بھائی مجھے معاف کرنا۔ دراصل میں تم کو پہچانا نہیں تھا۔ بات یہ تھی کہ ایک آدمی نے میری دکان میں چوری کی تھی اور میں اسی کو سمجھا تھا۔ لیکن وہ تو بڑا دبلا پتلا سوکھا سا تھا۔ میں سوچ ہی نہ سکتا تھا کہ تم ہو سکتے ہو۔" رنگساز نے افسوس کے ساتھ اپنے ہاتھ ملے کہ مجھ سے اتنی بڑی غلطی ہوئی کہ میں اپنے دوست کو پہچان نہ سکا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ لیکن اس میں تمہاری ہی غلطی تھی کہ تم نے اپنا نام بھی نہیں بتایا تھا۔ پھر اس روز میں اپنے کام کی وجہ سے بڑا پریشان تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود تم کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ مجھے معاف کرنا، اور اس واقعہ کو بھول جانا۔ شاید ہماری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔"

ابو صیر کو جیسے اطمینان ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "خدا تمہیں معاف کرے۔ تقدیر کو کون بدل سکتا ہے۔ آؤ اب

ہم اس بات کو اپنے دماغ سے نکال دیں اور پہلے جیسے ہو جائیں۔ اب تم پہلا کام یہ کرو کہ جاکر حمام میں نہاؤ۔"

ابو قیر نے پوچھا۔" اچھا یہ تو بتاؤ کہ یہ دن دیکھنا تم کو کیسے نصیب ہوا۔"

ابو صیر نے اپنی بیماری سے لے کر اب تک کے تمام حالات سنائے کہ کس طرح بادشاہ نے اس پر مہربانی کی اور اتنا شاندار حمام بنانے میں مدد دی اور اس کو رہنے کے لیے شاندار مکان دیا۔

ابو قیر نے کہا۔" مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ بادشاہ نے تمہاری اسی طرح مدد کی، جیسے مجھے کپڑے رنگنے کی دکان کھولنے میں مدد دی اور اب میں بادشاہ سے کہوں گا کہ تم میرے دوست ہو تاکہ وہ اور بھی تمہارا خیال رکھے۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ بادشاہ سے میرے بہت تعلقات ہیں۔"

ابو صیر نے کہا۔" بھائی، اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ بادشاہ کو خود میرا خیال ہے ـــــــ اچھا تم اندر جاؤ اور کپڑے اُتار کر بدن پر مالش کرا کے اچھی طرح نہاؤ۔" یہ کہہ کر وہ اسے اندر لے گیا اور اس نے بڑے شاندار طریقے سے نہلایا۔ اس کے بدن کی مالش کی۔ بڑے خوشبو دار مسالے سے اس کا بدن صاف کیا۔ جب وہ نہا چکا تو اس کو پھر ناشتہ کرایا اور پھلوں اور میووں کا شربت پلایا۔ سچ تو یہ ہے کہ ابو صیر اپنے دوست کو دوبارہ دیکھ کر اتنا خوش

ہوا کہ اس نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو بادشاہ کے ساتھ کیا تھا۔

جب ابو قیر حمام سے جانے لگا تو اس نے ابو صیر کو کچھ دینے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن ابو صیر نے ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ——— "اچھا تو تم مجھے نہانے کی قیمت دو گے؟۔ ارے بھائی ہمارے تعلقات تو ایسے ہیں کہ جن میں لین دین کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں سمجھو کہ یہ حمام تمہارا ہے۔ جب جی چاہے آؤ اور شوق سے نہاؤ۔"

ابو قیر نے کہا۔ "اچھا یہ بات ہے۔ تو میں بھی اس کام میں تمہاری مدد کروں گا یعنی میں ایک ایسا مسالہ تیار کروں گا جس سے ایک مرتبہ رگڑنے سے بدن کا میل فوراً چھٹ جاتا ہے اور پھر جب بدن پر پانی ڈالا جاتا ہے تو اس سے خوشبو آتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے نوکر کو بھیج کر کچھ سامان منگوایا اور اپنے ہاتھ سے اس کو پیس کر اور بہت باریک کپڑے سے چھان کر ابو صیر کو دیا اور کہا ——— "دیکھو یاد رکھو، اس کا استعمال ہر آدمی پر مت کرنا۔ صرف بادشاہ، اس کے وزیروں اور امیروں پر کرنا، ورنہ بلاوجہ تمہارا خرچ بڑھ جائے گا۔ یہ میرا خاندانی نسخہ ہے، اور اسے میں نے اس سے پہلے کسی کو نہیں بتایا تھا۔"

یہ کہہ کر ابو قیر حمام سے نکل کر سیدھا بادشاہ کے محل

میں پہنچا اور جب بادشاہ کے سامنے گیا تو بڑے ادب سے سلامی دینے کے بعد بولا۔" بادشاہ سلامت! میں اس وقت آپ کو ہوشیار کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

بادشاہ نے کہا۔" کس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے اور کیوں؟"

ابوقیر نے کہا۔" خدا کا شکر ہے کہ آپ آج تک ابو صیر سے بچے رہے۔ کیونکہ یہ آدمی آپ کا اور آپ کے مُلک کا بہت بڑا دشمن ہے۔ خدا اس کے ہاتھوں سے آپ کو ہمیشہ بچائے رکھے۔"

بادشاہ نے کہا۔" خیر تو ہے؟ آخر بات کیا ہے؟ وہ ایسا کون سا کام کر رہا ہے اور کیسے؟"

ابوقیر نے کہا۔" جہاں پناہ! وہ زہر کے ذریعے اپنا کام کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ایسا مسالا تیار کیا ہے جسے وہ آپ پر اور آپ کے وزیروں پر استعمال کرنا چاہتا ہے اس سے سارا بدن جلنے لگتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اس کے رگڑنے سے بدن کا میل چھٹ جاتا ہے اور جب بدن پر پانی ڈالا جاتا ہے تو اس سے خوشبو آتی ہے — اور وہ اس لیے یہ کر رہا ہے کہ دراصل وہ جاسوس ہے اور وہ صرف آپ کو مارنے کے لیے یہاں آیا ہے۔ میں آپ سے اس لیے یہ کہہ رہا ہوں کہ میرے اوپر آپ کے بہت احسانات ہیں۔"

بادشاہ یہ سنتے ہی کانپ اٹھا۔ اس کو ایسا لگا کہ جیسے اس کا بدن سچ مچ جل رہا ہے اور اس کو بہت غصہ آیا۔ اس نے کہا "دیکھو اس کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ میں ابھی خود اپنے وزیر کے ساتھ حمام جا رہا ہوں اور اپنے سامنے اس کا تجربہ کروں گا۔"

جیسے ہی بادشاہ حمام میں داخل ہوا۔ ابو صیر نے اس کا استقبال کیا اور کہا۔" حضور! اندر حمام میں چلیں؟"

بادشاہ نے کہا۔" پہلے ہمارے وزیر کو غسل کرواؤ۔"

ابو صیر نے کہا۔" جہاں پناہ! مجھے ایک ایسا پاؤڈر ملا ہے، جس کے رگڑنے سے بدن کا تمام میل چھوٹ جاتا ہے اور جب بدن پر گرم پانی ڈالا جاتا ہے تو اس سے بڑی خوشبو آتی ہے۔"

بادشاہ نے کہا۔" اسے پہلے وزیر کے پیروں پر زرا سا لگانا۔ پھر اس کے بعد بدن پر ملنا۔"

ابو صیر وزیر کو حمام کے اندر لے گیا، اور جب اس پاؤڈر کو زرا سا پیروں پر لگایا اس جگہ ایسی جلن ہوئی کہ وزیر چیخ اٹھا اور اس نے ابو صیر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ آواز سن کر بادشاہ فوراً حمام کے اندر داخل ہو گیا اور اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ" ابو صیر کو گرفتار کر لو۔"

وزیر نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور پھر بادشاہ ابو صیر کو گرفتار کرکے محل میں لایا اور اس نے حکم دے

دیا کہ حمام کو فوراً بند کردیا جائے۔ اس کے بعد بادشا نے جہاز کے کپتان کو حکم دیا کہ " ابوصیر کو ایک چونے کے بورے میں بند کرکے سمندر کے اندر ڈال دو کہ یہ اس بورے کے اندر جل کر مرجائے۔"

کپتان نے کہا۔" بادشاہ کے حکم پر عمل کیا جائے گا"

اتفاق سے یہ کپتان وہی تھا جس کی ابوصیر نے اپنے حمام میں بڑی خاطر مدارات کی تھی اور اس سے کوئی معاوضہ نہیں لیا تھا۔ یہ کپتان اسے ایک کشتی میں لے کر پاس کے ایک چھوٹے سے جزیرے میں لے گیا جہاں وہ اطمینان سے باتیں کرسکیں۔

کپتان نے کہا۔" میرے بھائی میں وہی آدمی ہوں جس کے ساتھ تم بڑی محبّت سے پیش آئے تھے اور تم نے اپنے حمام میں میری بڑی خاطر مدارات کی تھی۔ اب وقت آگیا ہے کہ میں اس کا بدلہ چکاؤں۔ اب تم اصل بات مجھے بتاؤ کہ تم نے ایسا کون سا جُرم کیا ہے کہ بادشاہ تم سے اتنا ناراض ہو گیا ہے۔ اور اس نے اتنی بڑی سزا کا حکم دیا ہے۔"

ابوصیر نے کہا۔" میں اپنے پیدا کرنے والے اللہ کی قسم کھاکر کہتا ہوں کہ میں بے قصور ہوں اور میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ بادشاہ مجھے ایسی سزا دے۔"

کپتان نے کہا۔" تب پھر اس میں تمہارے دشمنوں

کا ہاتھ ہوگا اس لیے کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو کسی
کو ترقی کرتے دیکھ کر خوش نہیں ہوتے۔ وہ دن رات
اس کو ختم کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن بھائی جسے
اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ تم ڈرو مت اور اطمینان
کے ساتھ اس جزیرے میں رہو۔ اپنا وقت مچھلی پکڑنے
میں گزارو۔ پھر جیسے ہی کوئی جہاز تمہارے وطن جائے گا
میں تم کو وہاں پہنچا دوں گا۔ اور اب میں جاتا ہوں اور
ایسی کوئی ترکیب کروں گا جس سے لوگوں کو معلوم ہو
کہ میں نے بادشاہ کی ہدایت کے مطابق تم کو ڈبو دیا۔
کپتان نے یہ کہہ کر ابوصیر کو مچھلی پکڑنے کا ایک جال
بھی دیا، اور خود واپس آگیا۔ پھر ایک چونے سے بھرا
ہوا بورا لیے ہوئے وہ محل کے پاس سے نکلا اور
دھارے میں لے جاکر اس نے بورے کو پانی میں لے جاکر
ڈال دیا۔ اتفاق سے بادشاہ بھی کھڑکی میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔
بادشاہ نے وہاں سے جو ہاتھ ہلایا تو اس کی انگلی سے انگوٹھی
نکل کر سمندر میں جا پڑی۔ یہ انگوٹھی یوں تو سونے کی تھی
اور اس میں ہیرے کا قیمتی نگ لگا ہوا تھا لیکن اس انگوٹھی
میں ایک جادوئی بات یہ تھی کہ جو کوئی اس کو پہنتا گویا اس
کے ہاتھ میں طاقت رہتی اور کوئی دشمن اس کی حکومت
کو ختم نہ کر سکتا تھا اور اگر خاص طریقے سے اشارہ کر
دے تو اس آدمی کا سر الگ جا پڑتا۔

جیسے ہی یہ انگوٹھی بادشاہ کی انگلی سے نکلی بادشاہ کو ایسا لگا کہ جیسے اس کے ہاتھ سے ساری طاقت نکل گئی۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ سمندر میں اس وقت بڑی زبردست لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اب انگوٹھی ملنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اس نے کسی سے کچھ نہ کہا۔

ادھر چونے سے بھرے بورے کے سمندر میں ڈالنے کے بعد کپتان ابو صیر کے پاس گیا اور اس سے بولا "میرے بھائی! میں ابھی آتا ہوں۔ اتنے تم مچھلی پکڑو۔ میرا ایک کام یہ بھی ہے کہ شاہی مطبخ کے لیے مچھلی پکڑوں اس لیے تم جال ڈال کر مچھلی پکڑو۔ جب شاہی مطبخ کے لڑکے آئیں تو ان کو مچھلی دے دینا۔" چنانچہ ابو صیر نے مچھلی پکڑنے کے لیے جال ڈالا۔ جیسے ہی اس نے جال نکالا، اس میں سے مچھلیاں نکلیں۔ اس نے پھر جال ڈالا، پھر مچھلیاں نکلیں۔ ذرا سی دیر میں وہاں مچھلیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ ابو صیر نے بہت دنوں سے مچھلیاں نہیں کھائی تھیں۔ اس نے سوچا کہ آج مچھلی کھانا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے اُن مچھلیوں میں سے ایک بڑی سی مچھلی نکالی اور چاقو سے اس کو کاٹا۔ جیسے ہی کاٹا، اس سے ایک دمکتی ہوئی انگوٹھی نکلی۔ یہ انگوٹھی وہی تھی، جو بادشاہ کی انگلی سے گری تھی۔ ابو صیر کو کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ کس کی انگوٹھی ہے اور

کیسی ہے۔ اس نے جلدی سے اپنی اُنگلی میں پہن لیا۔
زرا سی دیر میں شاہی مطبخ سے دو لڑکے آئے اور ابوصیر سے بولے "اے مچھیرے! زرا یہ تو بتاؤ کہ کپتان کدھر گیا۔ ہم اسے دیر سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ شاہی باورچی خانے کے لیے مچھلیاں دیا کرتا ہے۔ وہ آج کہیں نظر نہیں آرہا ہے۔"

ابوصیر نے بڑی تیزی سے ہاتھ اٹھاکر کہا "ادھر"——
اس کا کہنا تھا کہ ان دونوں لڑکوں کے سرکٹ کر گر پڑے۔ انگوٹھی سے ایک کرن سی نکلی اور ان دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ابوصیر گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ انھیں کس نے مارا ہے۔ وہ گھبرا گیا کہ ضرور یہ کسی جن کا کام ہے۔ ورنہ ابھی تو یہ اچھے خاصے تھے اور مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں کپتان بھی آگیا۔ اس نے جو دو لاشیں دیکھیں اور ابوصیر کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی انگوٹھی دیکھی تو وہ سمجھ گیا۔ کیونکہ وہ اس انگوٹھی کی خاصیت سے واقف تھا۔ اس نے ابوصیر سے کہا۔ اپنا ہاتھ مت ہلانا، ورنہ میری خیریت نہیں ہے۔ میرا سر بھی بدن سے الگ ہو جائے گا۔"

ابوصیر نے جو یہ سُنا تو سناٹے میں آگیا اور اپنی جگہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ کپتان نے کہا—— "کسی کی قسمت کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ابھی زرا دیر پہلے

تم کو بادشاہ نے موت کا حکم دیا تھا اور تم کمزور تھے، اور اب بادشاہ سے بھی زیادہ طاقتور ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم کو یہ انگوٹھی کیسے ملی۔ پھر میں تم کو اس کی کرامات بتاؤں گا۔"

ابو میر نے پھر اسے ساری بات بتائی اور کپتان نے اس انگوٹھی کی تاثیر بیان کی۔

پھر کپتان نے کہا۔" اب تم کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم نڈر ہوکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو سکتے ہو۔ ذرا سی دیر میں اپنے دشمنوں کو ختم کر سکتے ہو۔ یہاں تک کہ بادشاہ کو بھی۔" یہ کہہ کر کپتان نے اسے کشتی میں بٹھا کر شہر کے کنارے پہنچایا اور اسے لے کر محل کی طرف پہنچا۔ اس وقت بادشاہ نے دربار طلب کیا تھا۔ وہاں فوج کے سپاہی، درباری، وزیر، امیر، غرض سب ہی جمع تھے۔ بادشاہ کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ بادشاہ نے انگوٹھی کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہا تھا اور نہ اس کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ جیسے ہی اس نے ابو صیر کو دیکھا۔ وہ کانپ اٹھا اور وہ سمجھا کہ یقیناً یہ میرے خلاف سازش ہے اور ابو صیر مجھے مارنے آیا ہے۔ اس نے چیخ کر کہا۔" بدمعاش! تم کیسے جیتے بچے۔ میں نے تو تم کو اپنے سمندر میں ڈلوایا تھا۔"

حجام نے کہا۔" خدا جس کو چاہے، زندہ رکھے اور

جیسے چاہے مار ڈالے۔" یہ کہہ کر حجام نے سارا قصہ سُنایا اور بتایا کہ کس طرح یہ انگوٹھی اس کے ہاتھ آئی، اور کس طرح اس انگوٹھی کی وجہ سے آن جانے میں اس سے شاہی باورچی خانے کے دو لڑکے مرگئے۔ پھر اس نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اُتاری اور بادشاہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ـــــ "میں یہ انگوٹھی آپ کو واپس کرنے آیا ہوں۔ آپ کے میرے اوپر بہت احسانات ہیں اور میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کا دشمن نہیں ہوں۔ اگر میں دشمن ہوتا تو پھر اس انگوٹھی کی مدد سے اسی وقت آپ کو مار سکتا تھا۔ لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ بادشاہ سلامت اچانک مجھ سے کیوں ناراض ہو گئے۔ اور مجھے مارنے کا حکم کیوں دیا؟ اور اب بھی اگر بادشاہ کا یہ خیال ہے کہ میں مجرم ہوں تو مجھے اسی وقت مار ڈالیں۔ مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔"

بادشاہ نے وہ انگوٹھی تو جلدی سے اپنی اُنگلی میں پہن لی اور ابو صیر کو بڑھ کر سینے سے لگا لیا اور بولا۔ "میرے بھائی! مجھے معاف کرنا۔ مجھے تم کو سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری جگہ کوئی اور آدمی ہوتا تو وہ ہرگز یہ انگوٹھی واپس نہ کرتا۔ جہاں تک اصل معاملے کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں کے رنگساز ابو قیر نے یہ بتایا تھا کہ تم نصرانیوں کے جاسوس ہو اور یہاں مجھے مارنے کے

لیے آئے ہوئے" یہ کہہ کر بادشاہ نے ابو صیر کو اصل بات بتائی۔
ابو صیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے کہا۔
" جہاں پناہ! مجھے نہیں معلوم کہ وہ فرنگی بادشاہ کون ہے اور نہ میں کسی کا جاسوس ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ابو قیر میرا دوست ہے اور ہماری دکانیں اسکندریہ میں پاس پاس تھیں ـــــ اور ہم دونوں یہاں روزگار کی تلاش میں آئے تھے۔ ہم یہاں آ کر سرائے میں ٹھہرے تھے۔"
یہ کہہ کر ابو صیر نے بادشاہ کو شروع سے آخر تک سارا قصہ سنایا اور کہا ـــــ " اب میری درخواست ہے کہ سرائے کے چوکیدار اور میرے یہاں حمام کے ملازموں کو بلایا جائے۔ سرائے میں میرے ساتھ ابو قیر نے جو سلوک کیا تھا، وہ تو چوکیدار بتائے گا۔ لیکن حمام میں ابو قیر نے جو پاؤڈر مجھے دیا اس کا حال میرے حمام کے نوکر بتائیں گے۔"
بادشاہ کو ابو صیر کی بات کا یقین آ گیا۔ لیکن دربار میں ہر ایک کو مطمئن کرنے کے لیے اُس نے چوکیدار کو اور حمام کے نوکروں کو بُلایا اور انھوں نے بھی وہی بات بتائی جو ابو صیر نے کہی تھی۔
بادشاہ نے حکم دیا کہ " اسی وقت ابو قیر رنگساز کو قید کرکے میرے سامنے لایا جائے۔" وہ سپاہی ابو قیر کی دُکان پر گئے جب وہ وہاں نہ ملا تو اُس کے گھر پہنچے۔ وہاں وہ اطمینان سے پڑا ہوا تھا اور خوش ہو رہا تھا کہ اس نے

کتنی چالاکی سے ابو میر کا خاتمہ کیا۔ سپاہیوں نے اسے گرفتار کیا اور کوڑے مارتے اور گھسیٹتے ہوئے اُسے بادشاہ کے سامنے لائے۔ اس نے جو دیکھا کہ وہاں ابو میر بادشاہ کے پاس بیٹھا ہوا ہے اور حمام کے ملازم اور سرائے کا چوکیدار کھڑا ہوا ہے تو سمجھا کہ اس کی خیریت نہیں ہے۔

بادشاہ نے اس کی طرف بڑے غصّے سے دیکھا اور کہا۔ "ان کو پہچانتے ہو کہ یہ تمہارا دوست ہے جس نے تمہارے اوپر بہت احسانات کیے ہیں۔ تمہیں اپنے خرچے سے یہاں لایا۔ تمہارا خیال رکھا۔ لیکن تم اس کو سرائے کے اندر بیمار چھوڑ کر، اور اس کا روپیہ چُرا کر چلے گئے ــــــ اور جب وہ تمہاری دُکان پر پہنچا تو تم نے اس کو مار مار کر نکال دیا اور اس کو مارنے کی سازش کی۔ اگر اللہ اس کو نہ بچاتا تو بیچارہ کب کا مَر چکا ہوتا۔

چوکیدار اور ملازم چلّائے ــــــ "خدا گواہ ہے کہ ہم نے بھی اس کو ایسا ہی پایا، جیسا کہ جہاں پناہ نے فرمایا ہے ــــ"

بادشاہ نے کہا ــــــ "اب تم اپنا جُرم مانو یا نہ مانو لیکن تم کو اس کی پوری پوری سزا ملے گی۔ تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے گی۔" یہ کہہ کر بادشاہ

نے حکم دیا کہ "لے جاؤ اسے چونے کے بورے میں بند کرکے سمندر میں ڈال دو۔ دراصل اس سزا کا مستحق یہی ہے۔"

ابو صیر نے کہا ـــــ "جہاں پناہ! میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ابو قیر نے اب تک میرے ساتھ جو کچھ کیا اس کے لیے میں نے اسے معاف کیا۔"

بادشاہ نے کہا ـــــ "تم نے تو اسے معاف کردیا لیکن میں اسے معاف نہیں کرسکتا۔ اتنے بُرے آدمی کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تم نے جتنی بار اس کے ساتھ نیکی کی، اس نے اتنی ہی بار تمہارے ساتھ بُرائی کی ہے۔"

اس کے بعد بادشاہ کے سپاہی اسے پھر گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور بادشاہ کے حکم کے مطابق اسے سمندر کے اندر ڈبو دیا گیا جہاں وہ پانی میں جل کر مرگیا۔

اب بادشاہ نے ابو صیر سے کہا ـــــ "تم مجھ سے مانگو کیا مانگتے ہو۔ تمہاری ہر مانگ پوری کی جائے گی۔"

ابو صیر نے کہا ـــــ "بادشاہ سلامت! میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مجھے میرے مُلک پہنچا دیا جائے۔"

بادشاہ تو یہ چاہتا تھا کہ اسے اپنا وزیر بنالے لیکن ابو صیر نے کہا ـــــ "مجھے اپنا وطن اور اپنے دوست، اور عزیز رشتے دار یاد آرہے ہیں۔ اس لیے مجھے اجازت دیجیے۔"

بادشاہ نے ابو صیر کی خواہش پوری کی اور اسے خوب

مال و دولت دے کر ایک خاص جہاز سے رخصت کیا۔ پھر ابو صیر اسکندریہ پہنچا ــــ جب ابو صیر کا جہاز اسکندریہ کے ساحل پر پہنچا تو لوگ دیکھتے کیا ہیں کہ وہاں ایک بورا بھی بہتا ہوا آیا ہے۔ ابو صیر نے نوکروں سے کہا کہ "اسے کھول کر دیکھو کہ اس میں کیا ہے۔"

جب بورا کھولا گیا تو اس میں ابو قیر کی لاش تھی جو آخر کار اپنے وطن میں پہنچ گئی تھی۔

ابو صیر نے اپنے دوست کی لاش کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا اور اس پر لکھ دیا ــــ "ابو قیر یہاں دفن ہے، جس نے مرنے کے بعد بھی اپنے دوست ابو صیر کا ساتھ نہیں چھوڑا ــــ تمہاری نیکیاں زندہ تمہاری خوبیاں باقی۔"

ابو صیر عیش و آرام کی زندگی گزارتا رہا۔ اب بھی وہ اسی طرح صاف ستھری زندگی گزارتا۔ لوگوں کے کام آتا اور ہر ایک سے محبت کرتا۔ جب وہ مرگیا تو اس کی لاش کو بھی لوگوں نے اس کی وصیت کے مطابق ابو قیر کی قبر کے پاس دفن کر دیا۔

الہ دین کا چراغ

کہتے ہیں کسی زمانے میں چین میں ایک بہت ہی غریب درزی رہتا تھا، اس کا نام تھا مصطفیٰ ـــــ مصطفیٰ کے ہی لڑکا تھا ـــــ اس کا نام الہ دین تھا ـــــ مصطفیٰ تمام دن اپنی دکان میں بیٹھا رہتا اور کبھی الہ دین کی تعلیم و تربیت کی طرف دھیان نہ دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی عمر دس سال سے زیادہ ہوگئی تھی، لیکن اسے کچھ نہ آتا تھا۔ بس وہ تمام دن آوارہ لڑکوں کے ساتھ کھیلتا پھرتا۔ وہ بڑا ضدی اور کام چور ہوگیا تھا۔ ماں باپ کا کہنا نہ مانتا۔ بس کھانا کھانے کے لیے گھر میں داخل ہوتا۔ اس کے باپ نے بہت چاہا کہ اس کو درزی کا کام ہی سکھا دے۔ لیکن وہ موقع پاکر دکان سے بھاگ جاتا۔ اب تو اُس کے ماں باپ اُس کی طرف سے مایوس ہوگئے۔ مصطفیٰ درزی کو تو اتنا دکھ ہوا، اتنا دکھ ہوا کہ وہ بیمار ہوگیا اور آخر ایک دن بیماری میں اس کا کام تمام ہوگیا۔

الہ دین کی ماں نے جب دیکھا کہ اس کا لڑکا کسی طرح

بھی اُس دُکان کو نہ چلا سکے گا تو اس نے وہ دُکان اور اس کا سارا سامان بیچ دیا۔ اب بیچاری بڑھیا سوت کات کات کر بازار میں بیچتی۔ اس طرح اپنا اور اپنے نالائق بیٹے الہ دین کا پیٹ پالتی۔ باپ کے مرنے کے بعد تو الہ دین کو کسی کا ڈر نہیں رہ گیا۔ اب تو وہ آزادی سے گھومنے پھرنے لگا۔ یہاں تک کہ اُس کی عمر چودہ سال کی ہو گئی۔ لیکن اس کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ایک دن الہ دین لڑکوں کے ساتھ بازار میں کھیل رہا تھا کہ ایک اجنبی شخص وہاں آیا، اور وہ بڑے غور سے لڑکوں کو دیکھنے لگا۔ اچانک اس کی نظر الہ دین پر پڑی۔ یہ شخص ایک جادوگر تھا جو افریقہ کے ایک ملک مراقش سے آیا تھا۔ اس نے جیسے ہی الہ دین کو دیکھا تو اپنے دل میں کہنے لگا کہ یہی وہ لڑکا ہے، جس کو ڈھونڈتا ہوا میں مراقش سے یہاں تک آیا ہوں۔ بس میرا کام بن گیا۔ اس نے الہ دین اور اس کے ماں باپ کے بارے میں پہلے ہی معلوم کر لیا تھا، اس لیے الہ دین کے پاس جاکر کہا: "اے لڑکے! کیا تمہارا نام الہ دین ہے اور تم مصطفیٰ درزی کے بیٹے ہو؟"

"ہاں ــــ میں مصطفیٰ درزی کا بیٹا الہ دین ہوں۔ لیکن میرا باپ تو کئی سال ہوئے مرگیا۔"

یہ سنتے ہی اس شخص نے الہ دین کو سینے سے لپٹا

لیا اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

الہ دین نے کہا ـــــ "آپ کیوں روتے ہیں؟ کیا آپ میرے باپ کو جانتے ہیں؟"

"میرے پیارے بیٹے!" اُس شخص نے کہا ـــــ "میں اب تم سے کیا کہوں۔ میں تمھارا چچا ہوں۔ میں تو اپنے بھائی سے ملنے کے لیے اتنی دور کا سفر کر کے آیا ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا پیارا بھائی اس دنیا میں نہیں ہے ـــــ میری تو ساری آرزو مٹی میں مل گئی ـــــ" یہ کہہ کر وہ اور زیادہ رونے لگا۔ پھر بولا "میرے بیٹے! جب تم کھیل رہے تھے تو تم کو دیکھتے ہی مجھے خیال آیا کہ یہ لڑکا میرے بھائی سے ملتا جلتا ہے ـــــ یہ ضرور میرا اپنا بھتیجا ہے۔ بس اب تُو ہی میرا سہارا ہے" اس نے الہ دین کو سینے سے چمٹا لیا اور بولا ـــــ "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے میرے بھتیجے سے ملا دیا۔"

اس کے بعد اس نے الہ دین سے اس کے گھر کا پتا پوچھا اور اپنی جیب سے کچھ روپے پیسے نکال کر اُسے دیے اور بولا "بیٹا الہ دین! اپنی ماں سے میرا سلام کہنا۔ میں اس سے کل ملنے آؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ شخص چلا گیا اور الہ دین دوڑتا ہوا اپنے گھر گیا اور ماں سے جا کر بولا ـــــ "اماں! اماں! ہمارے ایک چچا بھی ہیں، وہ یہاں آئے ہیں۔ اُنھوں نے

سلام کہا ہے۔"

ماں نے کہا" الہ دین! تُو کیسی باتیں کرتا ہے۔ تیرے باپ کے کوئی بھائی نہیں تھا۔"

الہ دین نے کہا" نہیں ماں ــــــ وہ ابا کے بھائی ہیں۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا اور مجھے سینے سے لگا کر بہت روئے۔ وہ کل تم سے ملنے خود آئیں گے ــ انھوں نے مجھے بہت سارے پیسے دیے ہیں۔"

اگلے دن صبح کو جب الہ دین بازار میں لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا تو وہی شخص پھر وہاں آیا اور الہ دین کو گلے سے لگا کر بولا ــ" اپنی ماں کو یہ دو روپے دینا اور اُس سے کہنا کہ آج شام کو تمھارے ساتھ ہی کھانا کھاؤں گا۔ اس وقت ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

الہ دین دوڑتا ہوا گھر گیا اور ماں سے بولا۔" اماں! چچا نے یہ دو روپے دیے ہیں اور وہ آج شام کو ہمارے یہاں آئیں گے اور یہیں کھانا کھائیں گے۔"

الہ دین کی ماں دو روپے لے کر بازار گئی اور کھانے کے لیے اچھی اچھی چیزیں لائی۔ اس نے کھانا پکایا۔ جب شام ہوئی تو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ الہ دین نے دوڑ کر دروازے پر دیکھا تو اس کا چچا کھڑا تھا۔ وہ مارے خوشی کے پھولا نہ سمایا۔ اس کے ساتھ ایک مزدور بھی تھا، اس کے سر پر ایک ٹوکرا تھا جس میں طرح طرح کے پھل اور میوے

اور کھانے پینے کا سامان تھا۔ اس نے الہ دین کی ماں کو سلام کیا اور ٹوکرا اسے دیا اور بولا ——— "میرا بھائی! کہاں بیٹھا کرتا تھا ———؟" الہ دین کی ماں نے دالان کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اکدم سے دالان میں گیا۔ وہ اس زمین کے فرش کو بار بار چومتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔ اب تو الہ دین کی ماں کو بھی یقین آگیا کہ یہ ضرور میرے مرے ہوئے شوہر کا بھائی ہے۔ اس نے تسلّی دیتے ہوئے کہا ——
"الہ دین کے چچا! اب رونے دھونے سے کیا فائدہ۔ جو ہونا تھا، سو ہو گیا۔"

اس کے بعد وہ پھر منہ ہاتھ دھوکر کمرے میں جا بیٹھا۔
"میری پیاری بھابی! مجھے اتنے دن بعد دیکھ کر تم کو حیرت تو ضرور ہوئی ہوگی۔ کیونکہ میں تیس سال پہلے یہاں سے چلا گیا تھا۔ پھر ہندستان، عرب، مصر اور دوسرے ملکوں کی سیر کرتا پھرا، اس کے بعد وہاں سے مراقش چلا گیا۔ اب وہاں بیس سال سے رہ رہا تھا۔ ایک روز میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا تو مجھے اچانک مصطفیٰ بھائی یاد آئے۔ میں بہت رویا۔ بہت رویا۔ میری محبت نے اتنا جوش مارا کہ گھر سے نکل پڑا، اور دور دراز کا سفر کرتا ہوا یہاں آ پہنچا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میرے بھائی کا گھر کہاں ہے۔ میں بازار میں گھومتا پھر رہا تھا کہ اچانک مجھے بازار میں بہت سے لڑکے کھیلتے ہوئے نظر آئے۔ پھر میری نظر الہ دین

پر پڑی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے مجھے اپنا بھتیجا مل گیا ہو —— میں نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہی میرے بھائی کا بیٹا ہے۔ اس کو دیکھ کر میری ساری تھکن دور ہو گئی۔ لیکن افسوس کہ سب سے پہلے میں نے جو خبر سنی وہ اپنے بھائی کی موت کی تھی اور میرا دل دھک سے رہ گیا کہ ہائے میرا بھائی اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں تو شاید اس غم میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا لیکن الہ دین نے مجھے بڑی تسلّی دی۔

جب وہ شخص اپنی بات کہہ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ الہ دین کی ماں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اس نے الہ دین سے پوچھا "کیوں بیٹے تم کیا کام کرتے ہو؟ اس گھر کا خرچ کیسے چلتا ہے؟"

الہ دین نے مارے شرم کے اپنا سر جھکا لیا —— تو اس کی ماں نے کہا —— "بھیّا میں تم سے کیا کہوں کہ اس لڑکے کا کیا حال ہے۔ سارا دن مارا مارا پھرتا ہے۔ کوئی کام نہیں کرتا۔ اس کا باپ اسی غم میں مرگیا اور اب اس فکر میں روتے روتے میں بھی تقریبًا اندھی ہو گئی ہوں۔ بڑی مشکل سے کچھ سوت کات کات کر بازار میں بیچتی ہوں تو دونوں ماں اور بیٹے کا گزارہ ہوتا ہے۔ اس کو نہ اپنی فکر ہے نہ میری۔ یہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتا ہے اور کھانے کے وقت گھر میں داخل ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا ہے کہ اسے گھر میں نہ گھسنے دوں، لیکن کیا کروں ماں ہوں ——" یہ کہہ کر

وہ بہت روئی۔

اُس شخص نے الہ دین سے کہا۔" بیٹا! کتنے شرم کی بات ہے کہ تم تو کھیلتے پھرتے ہو اور تمھاری ماں اتنی مصیبت اٹھاتی ہے۔ تم کو چاہیے کہ محنت کرکے اپنی ماں کو کھلاؤ۔ تم اگر درزی کا کام نہیں سیکھنا چاہتے تو کوئی دوسرا کام سیکھ لو۔ اگر تم کہو تو میں تمھارے لیے ایک کپڑے کی دُکان کھلوا دوں۔ اس میں ساری دنیا کا بہترین کپڑا منگوا دوں گا۔ اور تم بڑی عزّت کے ساتھ کپڑے بیچنا اور مزے میں رہنا۔ میں تمھاری ملاقات کچھ سوداگروں سے کرا دوں گا۔ وہ لوگ تمھارا ہر طرح خیال رکھیں گے۔ اور پھر تمھارا کاروبار اتنا اچھا چلے گا کہ تم خوب عزّت سے رہوگے۔"

الہ دین کو رضامند پاکر وہ بہت خوش ہوا۔ اور بولا " مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے میری بات مان لی۔ اب تم بہت بڑے دُکاندار بن جاؤ گے، تمھاری اپنی دکان ہوگی۔ تم کو چاہیے کہ آوارہ لڑکوں کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دو۔ میں تم کو کل صبح لے جاؤں گا اور تمہارے لیے بڑا شاندار لباس خریدوں گا۔ ایک پگڑی بھی لے دوں گا۔ اس کو پہن کر تم ایک سوداگر لگنے لگو گے۔ پھر میں تمھارے لیے ایک اچھی سی دُکان تلاش کروں گا، جہاں بیٹھ کر تم اپنا کام کرسکو۔"

الہ دین کی ماں بڑی خوش ہوئی کہ خدا نے اس کی سُن لی اور اس کو اتنا اچھا رشتے دار بھیج دیا۔ اس نے

دستر خوان بچھا دیا اور کھانا لگا دیا۔ پھر تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ میں کل الہ دین کو کپڑے وغیرہ دلوانے جاؤں گا۔

اگلے دن وعدے کے مطابق صبح صبح وہ الہ دین کو لینے کے لیے آگیا۔ الہ دین اس کے ساتھ ہو لیا —— وہ اس کو کپڑوں کی عالیشان دُکان میں لے گیا، جہاں اس نے الہ دین کو بڑی قیمتی پوشاک دلوائی۔ اس کے لیے ریشم کی ایک پگڑی خریدی۔ ایک جوتا اور کمر کی پیٹی خریدی۔ الہ دین نے ایسا شاندار لباس پہلے کہاں دیکھا تھا، بہت خوش ہوا۔ اُس شخص نے اس کی قیمت دی۔ اور الہ دین سے بولا ——
"چلو، اب حمام چلیں۔ کیونکہ نئے کپڑے نہا دھو کر ہی پہننے چاہئیں۔"

اُس شخص نے الہ دین کو حمام میں لے جا کر خوب اچھی طرح نہلوایا، اور نئے کپڑے پہنائے۔ پھر ایک جگہ پہنچ کر اس کو بہت اچھا کھانا کھلوایا۔ اب تو الہ دین کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی شہزادہ ہو۔ اس نے اپنے چچا کا ہاتھ چوما اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد اس چچا نے الہ دین کو سارے شہر کی سیر کرائی۔ شاہی محل دکھایا، جامع مسجد دکھائی۔ سوداگروں کے طور طریقے سکھائے۔ پھر اپنے جاننے والے سوداگروں سے ملاقات کرائی۔ جب شام ہوئی تو اسے لے کر گھر آیا —— الہ دین کی ماں اپنے بیٹے کو

اتنے اچھے لباس میں اور اتنا صاف ستھرا دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے اُس شخص کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور بولی۔ میں ساری عمر تمھارے احسان کا بدلہ نہ چُکا سکوں گی۔ تم نے میرے ساتھ بڑی مہربانی کی۔

اُس شخص نے کہا "میرے بھائی کا بیٹا ـــــ میرا اپنا بیٹا ہے۔ وہ کوئی غیر تو ہے نہیں۔ اب تم اس کی طرف سے پریشان مت ہو۔ یہ بہت اچھا لڑکا ہو گیا ہے۔ خدا نے چاہا تو الہ دین ایک بہت بڑا سوداگر ہوگا، اور یہ گھر خوشحال ہو جائے گا۔ کل جمعہ کا مبارک دن ہے سارا بازار بند رہے گا۔ اس لیے میں کل اسے بڑے اچھے باغوں کی سیر کرانے لے جاؤں گا وہاں بڑے بڑے سوداگر سیر کرنے جاتے ہیں"۔

یہ کہہ کر وہ شخص چلا گیا۔

رات بھر مارے خوشی کے الہ دین کو نیند نہیں آئی۔ پھر جب صبح ہوتے ہوتے اس کی آنکھ لگی تو اس نے بڑے مزے مزے کے خواب دیکھے۔ سورج نکلنے کے بعد وہ جلدی سے اُٹھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھوئے، کپڑے بدلے، اور چچا کا انتظار کرنے لگا۔ ذرا سی دیر میں اس کو چچا آتا ہوا دکھائی دیا۔ الہ دین دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ پھر وہ شخص اسے لے کر چلا گیا۔ وہ الہ دین کو شہر کی ساری عمارتیں دکھاتا ہوا شہر سے باہر لے گیا۔ اب وہ شہر سے باہر، دُور بہت دُور نکل آئے۔ بیچارہ الہ دین چلتے چلتے تھک

گیا۔ اس سے پہلے وہ کبھی اتنا نہیں چلا تھا۔ وہ کہنے لگا
"چچا جان! ہم بہت دور نکل آئے ہیں شہر پیچھے رہ گیا،
اب تو کوئی باغ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ سامنے صرف پہاڑ
ہی پہاڑ ہیں۔ اب کتنی دور چلنا ہے۔ میں تھک گیا ہوں
اور مجھے بہت بھوک لگی ہے۔"

اُس شخص نے ایک تھیلے میں سے پھل، میوے اور مٹھائیاں
نکالیں اور الہ دین کو دکھلائیں اور بولے "بیٹا! میں تم کو
خاص طور پر جو جگہ دکھانے لایا ہوں، وہ یہاں سے بہت
قریب ہے۔ زرا ہمت سے کام لو۔ اب تم بچے نہیں رہے"
اس نے الہ دین کی ہمّت بندھانے کی کوشش کی اور پھر
اسے لے کر پہاڑی کے نیچے آیا۔ دراصل یہی وہ جگہ تھی
جس کے لیے وہ مراقش سے چل کر یہاں تک آیا تھا۔

"یہ ہے وہ جگہ" اس نے الہ دین سے کہا "زرا دیر آرام
کر لو پھر تم کو باغ دیکھنے کو ملے گا۔ ایسا باغ جس کی مثال
دنیا میں نہیں ملے گی۔ اس کو دیکھ کر تمھاری ساری تھکن دور
ہو جائے گی۔"

جب الہ دین تھوڑی دیر آرام کر چکا تو اُس شخص نے
کہا ـــــ "تم تھوڑی سی سوکھی لکڑیاں اکٹھا کرو، پھر تماشا
دیکھنا۔ الہ دین نے سوکھی لکڑیاں اکٹھا کر کے سامنے ڈھیر
لگادیا۔ اُس شخص نے پہلے تو لکڑیوں میں آگ لگائی۔ اُس
کے بعد اُس نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ

کر پاؤڈر چھڑکا۔ پاؤڈر کا چھڑکنا تھا کہ اس میں سے بڑا گہرا دھواں نکلا۔ اس دھوئیں کا نکلنا تھا کہ ساری زمین ہل گئی، چٹانیں لڑکھڑانے لگیں اور زمین میں ایک گڈھا پڑ گیا اور انھوں نے دیکھا کہ وہ گڈھا ایک پتھّر کی سِل سے ڈھکا ہوا تھا اور سِل کے بیچوں بیچ ایک تانبے کا کڑا تھا۔

الہ دین کے منہ سے ڈر کے مارے چیخ نکل گئی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا اور بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگا۔ وہ شخص اس کے پیچھے دوڑا۔ اس نے الہ دین کی گردن پکڑی اور اس زور سے تھپّڑ مارا کہ الہ دین کے منہ سے خون نکلنے لگا وہ زمین پر گر پڑا۔

پھر اُس شخص نے اُسے اُٹھایا اور بڑی محبت سے بولا "الہ دین! میں تم کو آدمی بنانا چاہتا ہوں۔ میں تمھارا چچا ہوں۔ اسی لیے میں نے تم کو مارا۔ تم کو میرا کہنا ماننا چاہیے۔ اب میری ہر ایک بات کو غور سے سنو۔ یہ سب کچھ میں تمھاری بھلائی کے لیے کر رہا ہوں۔ تم نے دیکھا کہ کس طرح میں نے جادو کے زور سے زمین کو کھول دیا ہے۔ اس پتھّر کی سِل کے نیچے ایک بہت بڑا خزانہ ہے۔ تمھارے علاوہ کوئی بھی اس کے اندر نہیں جا سکتا۔ میں بھی نہیں جا سکتا۔ اور یہ سارا خزانہ تم کو مل جائے گا۔ اب جیسا میں تم سے کہوں، ویسا کرو۔ پھر ہم اس کو آپس میں بانٹ لیں گے۔"

بیچارہ الہ دین مار کھانے کے بعد اتنا ڈر گیا تھا کہ اس

کے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے کہا ــــ "چچا جان! آپ جیسا کہیں، میں ویسا ہی کرنے کو تیار ہوں"

یہ سُن کر وہ بڑا خوش ہوا۔ اس نے الہ دین کو پیار کیا اور بولا "تم تو مجھے اپنے بیٹے کی طرح پیارے ہو۔ میرے کوئی بیٹا نہیں ہے، جو کچھ ہو تم ہو۔ میں نے تمھارے لیے ساری مصیبت اٹھائی ہے" یہ کہہ کر اُس نے الہ دین کی اُنگلی میں ایک چھلّا پہنا دیا اور اس سے کہا کہ "اب اس سِل کو اُٹھاؤ"

الہ دین نے کہا "چچا جان! اتنی بڑی سِل مجھ سے کیسے اُٹھے گی؟"

اُس نے کہا "اس چھلّے کی بدولت یہ سِل تنکے کی طرح اُٹھ جائے گی"

اور سچ مچ ایسا ہی ہوا۔ وہ سِل بڑی آسانی سے اُٹھ گئی۔ جب الہ دین نے اُسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس میں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اُس شخص نے کہا "اب تم ان سیڑھیوں پر سے اُترتے ہوئے جب نیچے پہنچوگے تو تم کو ایک تانبے کا دروازہ ملے گا۔ جیسے ہی تم آگے بڑھوگے۔ وہ دروازہ اپنے آپ کھُل جائے گا ــــ یہاں تم کو تین بڑے بڑے دالان نظر آئیں گے۔ پہلے دالان میں تین بڑی بڑی دیگیں ملیں گی۔ ان تینوں میں سونا چاندی اور ہیرے جواہرات بھرے ہوئے ہیں۔ یاد

رکھو، ان کو ہاتھ مت لگانا ورنہ تم پتھر کے بن جاؤگے
تم چلتے چلے جانا۔ جب تم تیسرے برآمدے میں پہنچوگے
تو تم کو ایک اور دروازہ نظر آئے گا۔ اس دروازے کے
اندر جب داخل ہوگے تو تم کو ایک پھلوں کا باغ ملے گا۔
تم اس باغ سے آگے بڑھوگے تو تم کو ایک زینہ ملے گا۔
اس زینے میں پچاس سیڑھیاں ہیں۔ تم اس زینے پر چڑھ کر
اوپر چھت پر چلے جانا۔ چھت پہ تم کو طاق میں ایک چراغ
رکھا ہوا نظر آئے گا۔ تم اس چراغ کو بجھا دینا۔ اس کا تیل
اور بتّی وہیں پھینک دینا اور اس چراغ کو جیب میں رکھ
کر میرے پاس واپس آجانا۔ جب تم واپس آؤ تو باغ میں
جو پھل لگے ہیں تمھارا جی چاہے تو انھیں توڑ کر لے آنا۔
جب تم اس چراغ کو لے کر اوپر آجاؤ گے تو پھر مزا
آجائے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے الہ دین کے گالوں کو محبّت سے
تھپ تھپایا اور کہا کہ "اب خدا کا نام لے کر چلے جاؤ۔"

اب الہ دین کی ہمّت بڑھ چکی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے
سیڑھیوں سے اُترتا چلا گیا۔ اسے چچا کی ایک ایک بات یاد
تھی۔ وہ برآمدوں سے باغ میں آیا اور باغ سے سیڑھیوں پر
چڑھتا ہوا چھت پر پہنچا۔ وہاں اسے طاق میں وہ چراغ جلتا
ہوا نظر آیا۔ اس نے چراغ کو بجھا کر تیل اور بتّی کو پھینک
دیا اور بڑی احتیاط سے اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

جب وہ واپسی پر باغ سے گزر رہا تھا تو اسے پیڑ نظر آئے۔ ہر پیڑ پر رنگ برنگے پھل لدے ہوئے تھے۔ اس نے ایسے پھل اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ یہ پھل نہیں ہیں بلکہ بیش قیمت ہیرے اور جواہرات ہیں۔ الہ دین نے انھیں درخت سے توڑ توڑ کر جیبوں میں بھر لیا اور لوٹ کر پھر اس گڈھے کے پاس آپہنچا۔ اور وہاں جاکر بولا " چچا جان! میں آگیا ہوں، مجھے اوپر کھینچ لو۔"

اُس شخص نے کہا " پہلے مجھے چراغ دو، تب میں تم کو نکالوں گا۔"

الہ دین نے کہا " پہلے مجھے نکالو، تب میں تم کو چراغ دوں گا۔" الہ دین کو ڈر لگنے لگا کہ کہیں بوڑھا چراغ لے کر چلا نہ جائے اور مجھے گڈھے میں پڑا رہنے دے۔

بوڑھا یہ سمجھا کہ الہ دین کی نیت خراب ہو گئی ہے اور اب یہ مجھے چراغ نہیں دینا چاہتا۔ اسے بہت غصہ آیا اور زور سے چیخا " سور کے بچے۔ مجھے چراغ دیتا ہے یا اسی گڈھے میں مرنا چاہتا ہے۔"

یہ سُن کر الہ دین ڈر گیا اور اُتر کر نیچے چلا گیا تاکہ اتنی دیر میں اس کے چچا کا غصہ کم ہو جائے تو وہ نکال دے گا۔

اب تو بوڑھا مایوس ہو گیا۔ اس نے بڑے غصے سے کہا۔ " اچھا تو تجھے اب اسی گڈھے میں سڑا دوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے آگ پر پاوڈر چھڑکا اور کچھ پڑھا۔ پتھر کی سِل اپنی

جگہ پر آگئی۔ اور وہ گڈھا پہلے کی طرح بند ہوگیا اور بوڑھا مایوس ہوکر واپس چلا گیا۔

دراصل یہ بوڑھا شخص ایک جادوگر تھا۔ یہ الہ دین کا چچا تھوڑے ہی تھا۔ وہ مراقش کا رہنے والا تھا۔ اس نے بچپن سے جادو سیکھنا شروع کردیا تھا اسے اپنے جادو کے زور سے پتا چلا تھا کہ چین میں ایک جادو کا چراغ ہے۔ جس کے پاس یہ چراغ ہو، جن اس کا غلام ہوجائے گا —— لیکن اس چراغ کو مصطفیٰ درزی کا بیٹا الہ دین ہی نکال سکتا ہے۔ اسی لیے وہ اتنا لمبا سفر کرکے الہ دین کو ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔

لیکن اس کا یہ خواب پورا نہ ہوسکا اور وہ الہ دین کو اس غار میں بند کرکے واپس چلا گیا۔

ابھی الہ دین غار میں بیٹھا تھا کہ اکدم زمین ہلی۔ الہ دین ڈر گیا کہ اب وہ اسی غار میں دب جائے گا۔ وہ تیزی سے سیڑھیوں پر اوپر چڑھنے لگا۔ لیکن غار کا منہ بند ہو چکا تھا۔ الہ دین کا دل دہل گیا۔ وہ زور زور سے چیخ چیخ کر رونے لگا۔ اس نے چچا کو آواز دینا شروع کی۔ "مجھے باہر نکالو۔ مجھ سے چراغ لے لو" لیکن وہاں کون سننے والا تھا۔ اب اسے یقین ہوگیا کہ یہ آدمی اس کا چچا نہیں۔ ورنہ وہ اُسے سور کا بچّہ کیوں کہتا اور پھر اسے اس حالت میں چھوڑ کر کیوں چلا جاتا۔ اسے اپنی ماں بہت یاد آئی جسے اس نے بہت ستایا تھا۔

اس طرح وہ دو دن یہاں پڑا رہا۔ بغیر کچھ کھائے پیے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس ترکیب سے نکلے۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا اور اس مایوسی میں وہ اپنے ہاتھ ملنے لگا۔ اس طرح ہاتھ ملنے سے اس کے چھلے میں جو رگڑ لگی تو اکدم ایک جن آگیا۔ اس نے بڑے زور سے کہا " تو نے مجھے بلایا ہے۔ کہو مجھ سے کیا کام ہے"

الہ دین اس جن کو دیکھ کر ڈر گیا۔ لیکن پھر اس نے ہمت کرکے کہا ــــ " مجھے اس غار سے باہر نکالو"

ابھی اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے کہ اس نے دیکھا کہ وہ اوپر میدان میں کھڑا تھا جس جگہ جادوگر نے آگ جلائی تھی، وہاں سے جن غائب ہو چکا تھا۔

الہ دین مارے خوشی کے پھولا نہ سمایا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ شہر کی طرف چل پڑا۔ جب وہ اپنے گھر پہنچا تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ اکدم سے ماں کی گود میں گر پڑا۔

جب الہ دین کو ہوش آیا تو اس نے ماں سے کہا " مجھے کچھ کھانے کے لیے دو۔ بھوک کے مارے میرا دم نکلا جارہا ہے"

اس کی ماں دوڑی ہوئی گئی اور گھر میں جو کچھ کھانا تھا وہ سب لائی۔ الہ دین نے بڑی تیزی کے ساتھ کھانا کھایا آخر دو دن سے بھوکا جو تھا۔ پھر اس نے غٹا غٹ پانی پیا۔

جب الہ دین خوب اچھی طرح کھا پی چکا تو بولا " اب سنو اس بدمعاش کی کرتوت، جس کو ہم لوگ اپنا رشتے دار سمجھ

رہے تھے۔ وہ میرے باپ کا بھائی نہیں بلکہ ایک جادوگر تھا۔
جانتی ہو اماں، اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔" یہ کہہ کر
الہ دین نے شروع سے آخر تک ماں کو سارا حال سُنایا۔

الہ دین کی ماں سُنتی جاتی تھی اور جادوگر بڈھے کو بُرا
بھلا کہتی جاتی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور
خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے میرے بچے کی جان بچائی۔

زرا سی دیر کے بعد الہ دین سو گیا۔ اگلے دن صبح جب
اس کی آنکھ کھلی تو الہ دین نے اپنی ماں سے کہا" اب میں بہت
اچھی طرح رہوں گا اور ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے تم
کو تکلیف پہنچے۔ میں آج ہی کام تلاش کروں گا۔ لیکن پہلے میرے
کھانے کے لیے کچھ لاؤ۔"

ماں نے کہا" بیٹا! میں تجھے کیا بتاؤں۔ گھر میں اب کچھ
بھی نہیں ہے۔ لیکن زرا سی دیر ٹھہر جا —— میں زرا سوت
کات کر بازار میں بیچ آؤں۔ پھر کھانے کا سامان لاؤں گی۔
اور تجھے کھانا پکا کر کھلاؤں گی۔"

الہ دین نے کہا —" اماں! اس وقت سوت مت کاتو۔
میں جو چراغ لایا ہوں، اسے لے آؤ۔ آج تو اسی چراغ
کو بیچ کر کام چلائیں۔"

الہ دین کی ماں کو یہ بات پسند آئی۔ وہ جلدی سے
چراغ لے کر آگئی۔ لیکن اس نے دیکھا کہ یہ چراغ بڑا گندا
ہے۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ اسے صاف کرکے بیچیں۔

کچھ نہ کچھ پیسے زیادہ مل جائیں گے۔ یہ سوچ کر وہ اسے صاف کرنے لگی۔ لیکن جیسے ہی اُس نے چراغ کو رگڑا اکدم سے ایک زبردست جِن سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اس نے الہ دین کی ماں کے سامنے سر جھکایا اور بولا "میں چراغ کا جن ہوں اور اس آدمی کا غلام ہوں، جس کے پاس یہ چراغ ہے۔"

الہ دین کی ماں نے ایسا جِن پہلے کہاں دیکھا تھا وہ اُسے دیکھ کر بے ہوش ہوگئی۔ الہ دین نے جلدی سے اپنی ماں کے ہاتھ سے چراغ لے لیا۔ اس نے اسی طرح کا ایک جِن غار میں دیکھا تھا وہ سمجھ گیا "اے چراغ کے جِن! ہم لوگ بہت بھوکے ہیں۔ ہمارے لیے بہت اچھا کھانا لے کر آؤ۔"

زرا سی دیر کے لیے جن غائب ہوگیا، اور پھر آگیا۔ اس کے سر پر چاندی کا بہت بڑا طباق تھا اور اس طباق میں سونے کے بارہ پیالے تھے، اور بڑی بڑی چھ روٹیاں تھیں۔ اس نے یہ سارا سامان الہ دین کے سامنے لاکر رکھ دیا اور پھر غائب ہوگیا۔

الہ دین نے اپنی ماں کے منہ پر ٹھنڈا پانی چھڑکا۔ اسے ہوش آگیا تو الہ دین نے کہا ــــ "اماں اللہ میاں نے ہمارے لیے کتنا اچھا کھانا بھیجا ہے۔ آؤ کھانا کھائیں۔"

الہ دین کی ماں نے کہا ــــ "بیٹا! پہلے یہ تو بتاؤ کہ یہ کھانا کہاں سے آیا؟"

الہ دین نے کہا "اماں پہلے کھانا تو کھا لو۔ پھر میں تم کو سارا قصہ سناؤں گا۔"

اب انھوں نے خوب مزا لے لے کر کھانا کھایا۔ بھوکے تو تھے ہی۔ پھر اتنا مزیدار کھانا انہیں اس سے پہلے کہاں ملا تھا۔ انھوں نے ڈٹ کر کھایا۔ جو کھانا باقی بچا، اسے اگلے دن کے لیے احتیاط سے رکھ دیا۔

کھانا کھانے کے بعد، الہ دین نے اپنی ماں کو جن کا سارا قصہ سنایا۔ یہ سن کر ماں بے حد گھبرا گئی اور بولی "تم یہ چراغ اور اپنی انگلی کا چھلا تو پھینکو، اس لیے کہ میں نہیں چاہتی کہ ہمارے گھر میں دیووں اور جنوں کا آنا جانا ہو —— ہم محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پال لیں گے۔"

الہ دین بولا "ماں! میں تمہارا ہر کہنا ماننے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن یہ چراغ اور چھلا نہیں پھینک سکتا۔ اگر یہ چھلا نہ ہوتا تو میں، اسی غار میں سڑ کر مر جاتا۔ اور اس چراغ کی بدولت ہم لوگوں کو اس مصیبت میں کھانا ملا ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ وہ بڈھا اسی چراغ کو حاصل کرنے کے لیے اتنی دور افریقہ سے یہاں تک سفر کرکے آیا تھا تاکہ اس چراغ کو لے جائے، لیکن خدا کی مہربانی سے یہ میرے ہاتھ لگا۔"

ماں نے کہا "اچھا تم اس کو رکھنا چاہتے ہو تو شوق سے رکھو، لیکن اس کو میری نظر سے دور رکھو۔" الہ دین نے اسے لے جا کر کوٹھری میں رکھ دیا۔

اس کھانے کو الہ دین نے دو روز تک کھایا۔ جب کھانا ختم ہوگیا تو اس نے سوچا کہ جن کو جلدی جلدی بلانا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے اُس نے سوچا کہ ان سونے کی تھالیوں کو بازار میں لے جاکر بیچنا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ ایک تھالی کو اپنے کپڑوں کے اندر چھپا کر بازار میں لے گیا۔ بازار میں ایک یہودی تھا جو سونے اور چاندی کا کاروبار کرتا تھا۔ یہ بڑا چالاک تھا۔ اس نے تھالی کو غور سے دیکھا اور بولا ــــ "اس کے کتنے دام لوگے؟"

الہ دین نے کہا۔ "تم خود یہ کام کرتے ہو۔ جو ٹھیک سمجھو وہ دے دو۔"

یہودی نے چپکے سے ایک دینار اس کے حوالے کیا، اور بولا "ویسے تو اس کے دام اس سے کم ہیں، لیکن تم بچے ہو، اس لیے تم کو کچھ زیادہ ہی دے رہا ہوں۔"

الہ دین نے اس دینار سے بازار سے کھانے پینے کا سامان خریدا اور گھر آیا۔ اب تو الہ دین کا یہ دستور ہوگیا کہ جب کھانے پینے کا سامان ختم ہوجاتا تو وہ ایک تھالی لے کر اسی یہودی کے ہاتھ ایک دینار میں بیچ دیتا۔ جب یہ بارہ کی بارہ تھالیاں ختم ہوگئیں تو وہ بڑا چاندی کا طباق لے کر نکلا۔ یہودی نے اس کے دو دینار دیے۔

اس طرح کچھ دن بڑے مزے میں ان دونوں کی گزر بسر ہوئی۔ الہ دین اب لڑکوں میں کھیلتا پھرتا بھی نہ تھا۔ وہ تمام دن

دکانداروں کے پاس بیٹھتا۔ باہر سے آنے والے سوداگروں سے بات چیت کرتا۔ اب اس کو دُنیا کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا تھا۔

جب یہ دو دینار بھی ختم ہو گئے تو الہ دین نے اپنی ماں سے کہا کہ" اب تم زرا سی دیر کے لیے باہر چلی جاؤ۔ میں جن کو بلاتا ہوں۔" جب اس کی ماں باہر چلی گئی تو الہ دین نے چراغ کو رگڑا۔ ایک گرجدار آواز ہوئی اور جن سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور بولا۔" میں چراغ کا جن ہوں اور اس آدمی کا غلام ہوں، جس کے پاس یہ چراغ ہے۔"

الہ دین نے کہا" ارے بھائی، چراغ کے جن! مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ میرے لیے اچھا سا کھانا لاؤ۔"

یہ سُن کر جن غائب ہو گیا اور فوراً ہی اپنے سر پر کھانے کا طباق لے کر آموجود ہوا۔ بالکل ویسا ہی جیسا اس سے پہلے لایا تھا۔ سونے کے بارہ پیالے اور چھ روٹیاں۔ اس کے ہاتھ میں آبنوس کی ایک جڑاؤ میز تھی جن نے بڑے تمیز سے کھانے کو میز پر سجایا اور غائب ہو گیا۔

زرا سی دیر میں الہ دین کی ماں بھی واپس آگئی۔ پھر دونوں نے دو تین روز تک مزالے لے کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد پہلے کی طرح الہ دین ایک پیالہ لے کر بازار گیا۔ جب وہ بازار سے گزر رہا تھا تو ایک جوہری نے اُسے آواز دی۔ یہ جوہری اپنی ایمانداری کے لیے مشہور تھا۔ جب

الہ دین اس کے پاس گیا تو اس نے کہا "بیٹا! میں اکثر دیکھتا ہوں کہ تم کچھ چھپائے ہوئے اس یہودی جوہری کی دکان میں داخل ہوتے ہو اور پھر وہاں سے خالی ہاتھ نکلتے ہو۔ میں تم کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ دکاندار بہت بے ایمان ہے۔ اگر تمہارے پاس سونے چاندی کی کوئی چیز ہے تو مجھے دکھاؤ، میں اس کے صحیح دام بتاؤں گا۔"

الہ دین نے فوراً وہ سونے کا پیالہ دکھایا۔ جوہری نے دیکھ کر پوچھا کہ تم نے ایسے کتنے پیالے یہودی کے ہاتھ بیچے ہیں اور اس نے تم کو کیا دیا؟"

الہ دین نے کہا کہ "میں نے اسے بارہ دینار میں ایسے بارہ پیالے بیچے۔"

تب جوہری نے اس پیالے کو ترازو سے تولا اور بولا "یہ پیالہ بڑے اچھے سونے کا بنا ہے اور اس کی قیمت دو سو دینار ہے۔ اگر تم کہو تو میں تم کو دو سو دینار دینے کے لیے تیار ہوں۔ البتہ تم چاہو تو بازار کے دوسرے جوہریوں کو بھی دکھا سکتے ہو۔"

الہ دین اتنے دینار دیکھ کر خوش ہوا۔ اس کو جوہری کی ایمانداری پر زرا بھی شک نہ تھا۔ اس نے جوہری کا شکریہ ادا کیا، اور یہ دینار لے کر گھر آیا۔ اگلے دن اس نے باقی گیارہ پیالے بھی اسی حساب سے اُسی جوہری کے ہاتھ بیچ دیے۔ اب تو الہ دین اور اس کی ماں خوب دولت مند ہو گئے۔ لیکن اُن

کے رہن سہن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ الہ دین غریب غربا کی بڑی مدد کرتا تھا۔ اب وہ بازار کے آوارہ لڑکوں میں اپنا وقت خراب نہیں کرتا تھا بلکہ اچھے اچھے آدمیوں کی صحبت میں بیٹھتا۔ جوہریوں کی دکان پر بیٹھ بیٹھ کر اس کی معلومات بھی بڑھ گئی تھی اور اس نے ان کے یہاں ایک سے ایک اعلیٰ قِسم کے ہیرے جواہرات دیکھے۔ اب اس کو پتا چلا کہ چراغ کے غار سے جو وہ رنگ برنگے پھل لے کر آیا تھا وہ دراصل قیمتی جواہرات تھے۔ اس نے ان تمام پھلوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ ایک بڑے سے بکس میں رکھ دیا تھا۔

ایک دن وہ بازار میں کچھ دکانداروں کے پاس بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا کہ اتنے میں بڑے زور سے منادی ہوئی —— "دکاندارو اور شہریو! شاہی اعلان سنو۔ ہماری شہزادی بدرالبدر حمّام میں نہانے کے لیے جارہی ہیں اس لیے سارا بازار بند کر دیا جائے اور تمام مرد اپنے اپنے گھروں میں چلے جائیں۔ جو کوئی بازار میں دکھائی دے گا، اس کا سر کاٹ دیا جائے گا۔"

الہ دین نے جب یہ اعلان سُنا تو بے اختیار اس کا جی چاہا کہ شہزادی کو دیکھے۔ وہ ایک جگہ چُھپ کر بیٹھ گیا، جہاں وہ تو ہر ایک کو دیکھ سکے، لیکن اُسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ اتنے میں اُدھر سے شاہی سواری گزری الہ دین کی نظر جو شہزادی پر پڑی، اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُس نے اتنی خوبصورت لڑکی اس سے پہلے کہاں دیکھی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ میں

کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں لیکن نہیں وہ لڑکی اس کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ جب وہ لڑکی حمام میں داخل ہوگئی تو الہ دین چپکے سے اپنے گھر آگیا اور چپ چاپ اپنے بستر پر جاکر لیٹ گیا۔ ماں یہ سمجھی کہ الہ دین کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ یہ دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی اور بولی "میرے بیٹے! کیا بات ہے، کیسی طبیعت ہے۔ میں ابھی جاکر حکیم کو بلاتی ہوں اور تیرا علاج کرتی ہوں"

الہ دین نے اپنا سر تکیے سے اٹھایا اور بولا "اماں! میں بیمار نہیں ہوں، بلکہ میں نے شہزادی بدرالبدر کو دیکھا ہے اور میں نے جب سے اسے دیکھا ہے میرے ہوش و حواس جاتے رہے ہیں۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں اچھا ہو جاؤں تو تم کسی طرح اس سے میری شادی کر دو"

یہ سنتے ہی الہ دین کی ماں گھبرا گئی۔ وہ سمجھی کہ الہ دین پاگل ہو گیا ہے۔ ورنہ کہاں ہم اور کہاں شہزادی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی شادی الہ دین سے ہو جائے۔ وہ بولی "میرے بیٹے! ہوش میں آؤ۔ ہم لوگ بادشاہ کی رعایا ہیں۔ ہماری کیا مجال کہ ہم شاہی خاندان میں شادی کے بارے میں کچھ سوچیں بھی ——— ہمیں اپنی حیثیت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے"

الہ دین نے کہا "اماں! میں بالکل ہوش میں ہوں۔ بس یہ کہ تم کسی طرح شہزادی سے میری شادی کرادو"

ماں نے بہت سمجھایا کہ "بیٹا! اگر پاس پڑوس میں

کوئی یہ بات سُن بھی لے گا تو ہماری خیریت نہیں ہے۔ پھر تم خود ہی سوچو کہ کس کی ہمّت ہے کہ بادشاہ کے سامنے ایسی بات بھی کہے۔"

الہ دین نے کہا "یہ کام صرف میری ماں کرے گی۔"

ماں نے کہا" بیٹا! اب بھی میری بات مان لے۔ تو خود سوچ کہ تو ایک غریب درزی کا بیٹا ہے۔ بھلا بادشاہ اپنی لڑکی کی شادی ایک درزی کے بیٹے سے کیسے کرسکتا ہے۔ اس کی شادی تو کسی شاہی خاندان میں ہی ہو گی۔"

الہ دین نے کہا" میں نے خوب اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ اگر تم اپنے بیٹے سے سچّی محبت کرتی ہو تو تم کو بادشاہ کے پاس جانا ہے۔ ورنہ تم مجھے جیتا نہ پاؤ گی۔"

بیچاری بڑھیا رونے لگی۔" بیٹا! تیرے سوا میرا کون رکھا ہے۔ اگر تجھ کو شادی کرنا ہے تو میں تیرے لیے بہت اچھی لڑکی ڈھونڈوں گی۔ لیکن خدا کے لیے بادشاہ کی لڑکی کا خیال چھوڑ دے۔ کہاں ہم غریب لوگ اور کہاں شاہی خاندان کے لوگ۔ پہلی بات تو یہ کہ مجھے بادشاہ کے دربار میں کون جانے دے گا۔ پھر میں اگر بادشاہ کے سامنے چلی بھی جاؤں تو اس سے کیسے کہوں گی ——— پھر بادشاہ کے سامنے جانے کے لیے اسے نذرانہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ تو خود سوچ کہ ہمارے پاس کیا رکھا ہے جو ہم بادشاہ کو تحفے کے طور پر پیش کریں گے۔"

الہ دین نے کہا: "میری پیاری ماں! تو نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بادشاہ کے دربار میں جانے کے لیے تحفے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک تحفے کا تعلق ہے۔ میرے پاس تحفہ بھی ایسا ہے، جس کو دیکھ کر بادشاہ بھی خوش ہو جائے گا۔ تم کو معلوم ہے کہ میں چراغ کے غار سے کچھ بڑے رنگین اور چمکدار قسم کے پھل لایا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ نہ پھل تھے اور نہ معمولی قسم کے پتھر۔ یہ تھے بہت قیمتی جواہرات۔ میں پچھلے کچھ دنوں سے جوہریوں کی دکان پر بیٹھا کرتا ہوں اور میں نے طرح طرح کے ہیرے جواہرات دیکھے ہیں۔ لیکن جیسے میرے پاس ہیں، اتنے قیمتی جوہریوں کے یہاں بھی مشکل سے ملیں گے۔"
یہ کہہ کر اس نے صندوق سے وہ جواہرات نکال کر رکھ دیے۔ اس نے جن کی لائی ہوئی ایک بڑی سونے کی تھالی میں ان جواہرات کو بڑے سلیقے سے سجایا۔ جیسے ہی الہ دین نے انھیں تھالی میں سجایا۔ رنگ برنگی روشنی سے سارا کمرہ جگمگانے لگا۔"

اس کو دیکھ کر الہ دین کی ماں تیار ہو گئی، اور بولی۔
"میں بادشاہ کے دربار میں یہ تحفہ لے کر جاؤں گی۔ مجھے یقین ہے کہ بادشاہ انھیں ضرور قبول کرلے گا۔ لیکن اگر بادشاہ نے یہ پوچھا کہ "تمھارا لڑکا کیا کرتا ہے۔ اس کا باپ کیا کرتا تھا تو میں کیا بتاؤں گی؟"

الہ دین نے کہا: "تم اس کی فکر نہ کرو۔ بادشاہ کی آنکھیں بھی ہمارے تحفے کو دیکھ کر چکا چوند ہو جائیں گی۔ پھر میرے

بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس وہ چراغ ہے جس کی بدولت مجھے خود کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اگلے دن الہ دین کی ماں جواہرات کا تحفہ لےکر بادشاہ کے دربار میں پہنچی۔ وہ تو اندر چلی گئی لیکن کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ بادشاہ دربار کے کام کرنے کے بعد اندر چلا گیا۔ بیچاری بڑھیا کیا کرتی، چُپ چاپ واپس چلی آئی، دوسرے دن پھر وہ اسی طرح گئی، لیکن اس دن بھی یہی ہوا۔ وہ چھ روز تک اسی طرح جاتی رہی۔ چھٹے روز بادشاہ نے اپنے وزیر سے کہا" میں کئی روز سے ایک بڑھیا کو دربار میں آتے دیکھتا ہوں۔ وہ کپڑے میں کوئی چیز لپیٹے ہوئے لاتی ہے۔ اب اگر کل پھر آئے تو اس کو میرے سامنے پیش کرنا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ اس طرح کیوں آرہی ہے؟"

الہ دین کی ماں اگلے دن پھر محل میں آئی اور روزانہ کی طرح بیٹھ گئی۔ بادشاہ کی نظر بڑھیا پر پڑی۔ اس نے وزیر سے کہہ کر اس کو بُلایا اور پوچھا" بڑی بی! تم کو یہاں دربار میں کیا کام ہے، جو روزانہ اس طرح آتی ہو۔"

الہ دین کی ماں نے کہا" بادشاہ سلامت! مجھے آپ سے کچھ ذاتی بات کہنی ہے اگر مجھے یہ بات اکیلے کہنے کا موقع ملے تو اپنی مرضی آپ کے سامنے عرض کروں۔"

بادشاہ نے سوائے وزیر کے سب کو باہر جانے کے

لیے کہہ دیا۔ اس کے بعد بڑھیا نے الہ دین سے شہزادی کی شادی کی بات کی اور کہا "جہاں پناہ! میں نے اپنے لڑکے کو ہر طرح سمجھایا لیکن میرا لڑکا نہ مانا اور میں مجبور ہوکر یہ درخواست آپ کے پاس لے کر آئی ہوں اور آپ سے معافی چاہتی ہوں۔"

بادشاہ نے بڑے غور سے بڑھیا کی بات سُنی اور پوچھا۔ "لیکن تمھارے پاس کپڑے میں کیا چیز ہے؟" بڑھیا نے فوراً کپڑا اُتارا اور بادشاہ کے سامنے جواہرات کی طشتری رکھ دی اور کہا "کہ میرے بیٹے نے یہ تحفہ آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔"

بادشاہ ان جواہرات کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ ان کی چمک دمک نے اس کی آنکھوں میں چکا چوند کردی۔ بادشاہ نے وزیر سے کہا "اس تحفے کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے جس کے پاس اتنے قیمتی جواہرات ہوں۔ کیا میری بیٹی اس کے لائق نہیں۔؟"

بادشاہ کا وزیر تو یہ دیکھ کر اور بھی گھبرا گیا کیونکہ وہ اپنے بیٹے سے شہزادی کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا "یہ سچ ہے کہ جس آدمی نے اتنا قیمتی تحفہ بھیجا وہ یقیناً شہزادی کے لائق ہے، لیکن ہم اس نوجوان کو بالکل نہیں جانتے۔ اس لیے آپ جو کچھ کرنا چاہیں، وہ تین مہینے کے بعد کریں۔"

بادشاہ نے کہا "بڑی بی! اپنے بیٹے سے کہنا کہ میں شادی کے لیے تیار ہوں، لیکن شادی کی تیاری کے لیے کم سے کم تین

مہینے لگیں گے۔"

بڑھیا بڑی خوشی خوشی گھر واپس آئی اور اس نے الہ دین کو یہ خبر سنائی۔ الہ دین یہ سُن کر بہت خوش ہوا اور اس نے انتظار کرنا شروع کر دیا۔

ایک دن بڑھیا جب بازار گئی تو اسے سڑکوں پر بڑی رونق نظر آئی۔ ہر طرف چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔ بازار میں صفائی کی جا رہی تھی۔ بڑھیا نے ایک دکاندار سے پوچھا "آج کیا خاص بات ہے جو بازار میں اتنی چہل پہل ہے۔"

دکاندار نے کہا "بڑی بی! تم کہاں رہتی ہو، تم کو اتنی بات نہیں معلوم کہ آج شام کو شہزادی بدرالبدر کی شادی وزیر کے لڑکے سے ہو رہی ہے۔"

یہ سُنتے ہی الہ دین کی ماں اُلٹے پاؤں گھر واپس آئی اور اس نے ساری بات الہ دین کو سنائی الہ دین یہ خبر سُن کر سناٹے میں آگیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور وہ روڑا ہوا اپنی کوٹھری میں گیا۔ اس نے چراغ کو رگڑا۔ چراغ کے رگڑتے ہی جن سامنے آگیا اور بولا "میں چراغ کا جن ہوں اور اس کا غلام ہوں، جس کے پاس یہ چراغ ہے ——" بتاؤ میرے لیے کیا حکم ہے۔"

الہ دین نے کہا "میری بات کو بڑے دھیان سے سنو۔ بادشاہ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دے گا، لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے بجائے

وہ وزیر کے بیٹے کو اپنا داماد بنا رہا ہے۔ اس لیے مجھے تم سے کام ہے کہ تم آج کی رات کو شہزادی اور وزیر کے لڑکے کو یہاں لے آؤ۔"

جن نے کہا: "میں آپ کا حکم بجا لاؤں گا۔"

جیسے ہی رات ہوئی جن دونوں کو لے کر الہ دین کے پاس آ گیا۔ الہ دین نے وزیر کے لڑکے کو ایک دوسرے کمرے میں بند کروا دیا اور شہزادی کو اپنے کمرے میں بٹھا دیا۔ پھر اس نے شہزادی سے ساری بات بتائی کہ کس طرح بادشاہ نے اس کی ماں سے شہزادی کی شادی کا وعدہ کیا اور پھر پنی بات سے پھر گیا۔ لیکن بیچاری شہزادی سہمی ہوئی تھی۔ س کے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

جب صبح ہوئی تو الہ دین نے شہزادی اور وزیر کے ڑکے کو پھر ان کے محل واپس بھجوا دیا۔ صبح کو جب بادشاہ ور ملکہ شہزادی کے پاس گئے تو انھوں نے دیکھا کہ وہ گھبرائی ہوئی ہے۔ بادشاہ نے بہت پوچھا کہ آخر کیا بات ہے، لیکن شہزادی نے کچھ نہیں کہا۔ البتہ جب بادشاہ چلے گئے اور اس کی ماں اکیلی رہ گئی تو اس نے اپنی ماں کو رات کا سارا قصہ سُنایا۔ اس کی ماں یہی سمجھی کہ شہزادی نے کوئی ڈراونا خواب دیکھا، اس لیے اس نے اسے تسلی دی اور کہا: "اس کا کسی سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اگلے دن پھر رات کے وقت الہ دین نے جن کو حکم

دیاکہ شہزادی اور وزیر کے لڑکے کے پلنگ کو اسی طرح یہاں پھر لے آیا جائے۔ پچھلی رات کی طرح پھر یہی ہوا اور صبح کے وقت جن نے دونوں کو محل میں واپس کردیا۔ اب تو شہزادی اتنی ڈر گئی تھی کہ اس نے اپنے باپ سے ساری بات کہہ دی۔

بادشاہ نے کہا" تم نے مجھ سے پہلے ہی کیوں نہیں کہا تھا۔ بہرحال اب میں اس کا انتظام کرتا ہوں کہ کل پھر ایسا واقعہ نہ پیش آئے" یہ کہہ کر بادشاہ نے وزیر کو بلایا۔ وزیر کے لڑکے نے اپنے باپ کو پہلے ہی سارا قصہ سُنا دیا تھا اور کہا تھا کہ میں شہزادی سے اب کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ چنانچہ جب بادشاہ نے وزیر سے کہاکہ یہ شادی ختم کردی جائے تو وزیر نے بادشاہ کی بات مان لی۔ چنانچہ اسی دن اعلان کردیا گیا کہ شہزادی اور وزیر کے لڑکے کی شادی توڑ دی گئی ہے۔

اب تو الہ دین بہت خوش ہوا اور جیسے ہی تین مہینے کی مدت ختم ہوئی۔ الہ دین نے اپنی ماں کو بادشاہ کے دربار میں بھیجا۔ بادشاہ بڑھیا کو دیکھتے ہی سمجھ گیا۔ اس نے اپنے وزیر سے مشورہ کیا اور پھر بڑھیا سے بولا" بڑی بی! میں بڑی خوشی سے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے تیار ہوں۔ لیکن پہلے میں یہ اطمینان کر لینا چاہتا ہوں کہ تمھارا لڑکا اتنا دولت مند بھی ہے کہ میری بیٹی کا شاہی خرچ برداشت کرسکے۔ اپنے

لڑکے سے کہو کہ وہ میرے دربار میں چالیس سونے کے طشت میں لدے ہوئے جواہرات بھیجے جو چالیس حبشی غلام اپنے کندھوں پر لے کر آئیں۔"

الہ دین کی ماں واپس گئی اور اس نے الہ دین سے ساری بات کہی۔

الہ دین نے کہا "یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں تو اپنی شہزادی پر نہ جانے اس سے کتنا زیادہ روپیہ خرچ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اب تم کھانا پکاؤ۔ میں اس کا انتظام کرتا ہوں۔"

الہ دین نے فوراً چراغ کو رگڑ کر جن کو بلایا اور اس سے کہا "بادشاہ نے اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنے کو کہا ہے۔ لیکن اس نے چالیس حبشی غلاموں کے کندھوں پر چالیس سونے کے طشت لدے ہوئے جواہرات طلب کیے اور کہا "جاؤ ان کو لے کر آؤ۔"

زرا سی دیر میں جن چالیس حبشی غلاموں کو لے کر آگیا۔ ان کے سروں پر سونے کے چالیس طباق تھے اور ان سب میں ہیرے جواہرات بھرے ہوئے تھے اور ان میں ہر ایک کے ساتھ چالیس حبشی غلام بھی تھے۔

جب الہ دین کی ماں بازار سے واپس آئی تو یہ سب کچھ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ الہ دین نے کہا "اماں! تم ان کو ساتھ لے کر محل چلی جاؤ اور یہ تمام چیزیں بادشاہ کو پیش

کر دو۔"

جب یہ جلوس شہر کی سڑکوں سے گزر رہا تھا تو لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل نکل کر دیکھ رہے تھے۔ ہر طرف شور مچا ہوا تھا۔ اس لیے کہ اس سے پہلے کسی نے یہ منظر کہاں دیکھا تھا۔

اس طرح یہ جلوس محل میں پہنچا۔ بادشاہ نے محل کے تمام دروازے کھلوا دیے۔ یہ جلوس بڑی شان کے ساتھ محل میں داخل ہوا اور انھوں نے چالیس کے چالیس طباق بادشاہ کے قدموں میں رکھ دیے۔ الہ دین کی ماں نے بڑے ادب سے کہا "جہاں پناہ! یہ حقیر سا تحفہ میرے بیٹے نے شہزادی کے لیے بھیجا ہے۔ حالانکہ یہ شہزادی کے شایانِ شان نہیں ہے۔ لیکن ہمیں اُمید ہے کہ آپ اس حقیر سے تحفے کو قبول کر لیں گے۔"

بادشاہ تو یہ سب کچھ دیکھ کر بہت ہی خوش ہوا۔ اس نے فوراً طے کر لیا کہ اپنی لڑکی کی شادی الہ دین سے ہی کرے گا۔ بادشاہ نے بڑھیا سے کہا "بڑی بی! تم اسی وقت جاؤ اور اپنے لڑکے سے کہو کہ میں اس کا محل میں استقبال کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

الہ دین کی ماں فوراً اپنے گھر گئی۔ الہ دین تو اس کا انتظار کر ہی رہا تھا۔ جیسے ہی اُس نے سُنا کہ بادشاہ نے اسے دعوت دی ہے، وہ بہت خوش ہوا۔ وہ فوراً اپنی

کوٹھری میں گیا۔ اس نے چراغ کو رگڑا۔ چراغ کو رگڑنا تھا کہ اکدم سے جن سامنے آگیا اور بولا ؛ میں چراغ کا جن ہوں ——— جس کے پاس یہ چراغ ہے، میں اس کا غلام ہوں ؛

الہ دین نے کہا ؛ چراغ کے جن! تم میرے لیے ایک شاہی لباس لے کر آؤ، جس کو دیکھ کر چین کے لوگ حیران رہ جائیں اور جس سے بہتر لباس سلطان نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ میں بادشاہ کے سامنے جارہا ہوں ؛

زرا سی دیر میں جن ایک شاندار شاہی لباس لے کر آگیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک گھوڑا بھی تھا جو بڑی خوبصورت جڑاؤ زین سے سجا ہوا تھا۔ بیالیس غلام ساتھ تھے اور ہزاروں لاکھوں سونے چاندی کے سکے تھے تاکہ الہ دین جس راستے سے گزرے، وہ سونے چاندی لٹاتا ہوا جائے۔

الہ دین گھوڑے پر سوار ہوکر روانہ ہوا۔ وہ جس راستے سے گزرتا، دولت کی بارش کرتا جاتا تھا اسطرح شاہانہ انداز سے یہ جلوس شاہی محل پہنچا۔ بادشاہ نے تخت سے اتر کر الہ دین کا استقبال کیا اور اسے ایک بہت بڑے کمرے میں لے گیا، جہاں بڑی شاندار دعوت کا انتظام کیا گیا تھا۔ الہ دین نے شاہی خاندان کے لوگوں کے ساتھ کھانا کھایا۔

کھانا کھانے کے بعد بادشاہ نے الہ دین سے کہا ؛ اگر تم آج محل میں ٹھہرو تو میں شام کو شادی کا انتظام کردوں ؛

الہ دین نے بڑے ادب سے کہا " عالی جناب! میری درخواست ہے کہ آپ مجھے ذرا سی مہلت دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں شہزادی کے شایانِ شان ایک محل تعمیر کروں۔ اگر آپ کی نظر میں اس کے لیے کوئی مناسب جگہ ہو تو مجھے اجازت دیجیے کہ وہاں کوئی محل بنا دیا جائے۔ میں بہت تیزی کے ساتھ محل بنواؤں گا۔"

بادشاہ اس بات سے بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا "میرے عزیز! ہمارے محل کے سامنے ایک بہت بڑا میدان ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو یہاں اپنا محل بنوالو۔"

الہ دین بادشاہ کے پاس سے رخصت ہو کر گھر آیا، اور اس نے چراغ رگڑ کر جن کو بلایا اور اس سے کہا۔ " بھائی جن! تم نے میرے تمام کام بڑے سلیقے اور پھرتی کے ساتھ کیے ہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ شاہی محل کے سامنے کے میدان میں ایک بہت شاندار محل بنا دو جہاں ہماری شہزادی رہ سکے۔ اس محل میں ایک بہت بڑا ہال ہو، جس میں سونے اور چاندی کی پچیکاری ہو۔ اس میں تئیس کھڑکیاں ہوں جن میں ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے ہوں۔ جب یہ محل تعمیر ہو جائے تو مجھے بتا دینا۔"

اگلے دن صبح جب الہ دین کی آنکھ کھلی تو جن داخل ہوا اور بولا " اے میرے مالک! آپ کا محل تیار ہے آپ خود جا کر اس کو دیکھ لیں۔"

جن فوراً ہی الہ دین کو وہاں لے گیا۔ الہ دین اس محل کو دیکھ کر بے حد خوش ہوا اور بولا " واہ بھائی واہ! بڑا شاندار محل ہے۔ ایسا محل تو شاید ہی کسی بادشاہ کا ہو۔ البتہ میں تم سے ایک بات کہنا بھول گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے محل کے دروازے سے لے کر بادشاہ کے محل تک ایک مخمل کا قالین بچھا دیا جائے۔"

ابھی الہ دین کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ ذرا سی دیر میں محل کے سامنے ایک قالین بچھ گیا۔ جن الہ دین کو اس کے گھر لے گیا۔

ذرا سی دیر میں جب بادشاہ کے محل کے دروازے کھلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جہاں سامنے کل تک ایک میدان تھا وہاں ایک خوبصورت محل بنا کھڑا ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو گیا۔ وزیر نے جب اپنی آنکھ سے یہ منظر دیکھا تو گھبرا گیا اور دوڑتا ہوا بادشاہ کے پاس گیا اور بولا " جہاں پناہ! مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آ رہا ہے، آج تک کوئی مکان اتنی تیزی سے نہیں بنا۔"

بادشاہ نے کہا " اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ اُس کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

اِدھر الہ دین نے گھر آ کر دیکھا کہ اس کی ماں بڑے شاندار لباس میں بیٹھی ہوئی ہے۔ تب اسے یاد آیا کہ اس نے خود جن سے کہہ کر ماں کے لیے بھی شادی میں پہننے کے لیے

ایک بڑا اچھا لباس تیار کروایا تھا۔ اس کے بعد الہ دین اپنی ماں کو لے کر اپنے نئے محل میں آیا۔ الہ دین بڑی احتیاط سے اپنا چراغ بھی لے آیا تھا۔

اب تو بڑے زور شور سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ الہ دین نے جن کی مدد سے شادی کا بڑا اچھا انتظام کر دیا تھا۔ ہر طرف چہل پہل ہو گئی۔ شام کو شہزادی بدرالبدر سے الہ دین کی شادی ہو گئی۔

اگلے دن الہ دین نے بادشاہ کو اپنے محل میں دعوت دی۔ اتنا شاندار محل دیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ دیواروں میں جڑے ہوئے ہیرے جواہرات دیکھ کر اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ اس نے اتنی شاندار کھڑکیاں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں، لیکن ایک کھڑکی دیکھ کر وہ حیرت میں رہ گیا۔ کیونکہ اس کھڑکی میں ابھی کام پورا نہ ہوا تھا۔

بادشاہ نے کہا " ارے یہ کھڑکی تو ابھی پوری نہیں ہوئی کیا بات ہے ؟"

الہ دین نے کہا " میں نے جان بوجھ کر یہ کھڑکی پوری نہیں کروائی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے کاریگر اسے پورا کریں"

بادشاہ نے کہا " یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ ہمارے کاریگر کو بھی اس محل میں کام کرنے کا موقع ملے گا"

اس کے بعد بادشاہ نے اپنے کاریگروں کو حکم دیا کہ وہ اس کھڑکی کا کام ختم کریں۔ لیکن جب کام شروع ہوا تو شاہی

خاندان کے تمام جواہرات ختم ہو گئے تھے اور ابھی کھڑکی آدھا کام بھی ختم نہیں ہوا۔ اس لیے الہ دین نے کاریگروں سے کہا کہ "یہ جواہرات نکال لو اور اپنے خزانے میں لے جاؤ۔ میں خود اس کام کو مکمل کرادوں گا۔"

یہ کہہ کر الہ دین نے اپنے جن کو بلایا اور اس سے کہا کہ اس کام کو ختم کردو۔ جن نے ذرا سی دیر میں یہ کام ختم کر دیا اور یہ کھڑکی دوسری تیئیس کھڑکیوں کی طرح جگمگانے لگی۔

بادشاہ بھی یہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔

اب الہ دین اور شہزادی بدرالبدر بڑے مزے میں اس محل میں رہتے رہے۔ الہ دین سے شہر کے تمام لوگ محبت کرتے تھے۔ وہ جس سڑک سے گزرتا، دولت کی بارش کرتا۔ شہر میں کوئی غریب آدمی نہیں رہا تھا۔ سب لوگ کھاتے پیتے اور الہ دین کو دعا دیتے۔

اب آئیے اس جادوگر کا حال [illegible] کہا جوابن کر آیا تھا۔ یہ بڈھا جادوگر برسوں تک [illegible] غار میں مر چکا ہوگا۔ لیکن ایک دن اُسے اپنے جادو کے زور سے معلوم ہوا کہ الہ دین نہ صرف زندہ ہے بلکہ اسے چراغ کا حال بھی معلوم ہوا ہے اور وہ چراغ کے جن کی بدولت عیش و آرام کی زندگی گزار رہا ہے۔ اب تو اس کے غصے کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ اس سے بدلہ لینے کے لیے چین روانہ ہو گیا۔ چین میں پہنچ کر اسے الہ دین کا حال معلوم ہوا۔ اس کا محل دیکھ

کر تو اس کا خون کھولنے لگا۔ اس نے سوچا کہ کسی نہ کسی ترکیب سے میں چراغ کو اس کے ہاتھ سے لے لوں گا اور الہ دین کو پھر اُسی جگہ پہنچا دوں گا جہاں وہ تھا۔

اتفاق سے جب بڈھا جادوگر شہر میں آیا تو الہ دین شکار کے لیے گیا ہوا تھا۔ جادوگر نے ایک دُکان سے جاکر بڑے خوبصورت خوبصورت بارہ چراغ خریدے اور اسے ایک ٹوکرے میں رکھ کر الہ دین کے محل کے چاروں طرف پھرنے لگا۔ وہ زور زور سے خوانچے والوں کی طرح چلّاتا جاتا تھا۔ "پُرانے چراغ کے بدلے نئے چراغ لے لو"——— پُرانے چراغ کے بدلے نئے چراغ لے لو۔"

جو سُنتا وہ حیران رہ جاتا کہ یہ کیسا پاگل ہے جو پُرانے چراغ کے بدلے نئے چراغ دے رہا ہے اس کے پیچھے پیچھے لڑکے تالیاں بجا رہے تھے، لیکن جادوگر اُسی طرح آوازیں لگاتا رہا۔

محل کی ایک کنیز نے جب یہ سُنا تو وہ دوڑی دوڑی شہزادی کے پاس آئی اور بولی: "ایک پاگل آدمی پُرانے چراغ کے بدلے میں نیا چراغ دے رہا ہے۔ اگر آپ کہیں تو ہم بھی اپنا پُرانا چراغ دے کر نیا چراغ لے لیں۔ ہمارے یہاں کوٹھری میں ایک پُرانا چراغ پڑا ہوا ہے۔"

شہزادی نے کہا: "اگر وہ بدل دے تو ضرور بدل ڈالو۔"

کنیز وہ چراغ لے کر بُڈھے جادوگر کے پاس گئی۔ جادوگر اسے دیکھ کر فوراً پہچان گیا کہ ضرور یہی وہ چراغ ہے جس کی

تلاش میں وہ یہاں تک آیا تھا۔ اس نے جلدی سے نیا چراغ دیا اور پرانا چراغ لے کر بھاگا۔ جب وہ ایک سنسان جگہ پر آیا تو اس نے نئے چراغوں کا ٹوکرا پھینک دیا۔ جلدی سے چراغ کو رگڑا۔ اکدم سے جن سامنے آیا اور بولا۔
"میں چراغ کا جن ہوں اور جس کے پاس یہ چراغ ہے اس کا غلام ہوں۔"

جادوگر نے کہا——"میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ الہ دین کے محل کو اسی حالت میں افریقہ میں میرے یہاں پہنچادو۔"

اگلے روز جب بادشاہ اٹھا تو کھڑکی میں سے جو اس نے دیکھا تو الہ دین کے محل کا نام و نشان بھی دکھائی نہ دیا۔ وہ حیران رہ گیا، اس کو تو بس وہی میدان نظر آیا جیسا کہ محل بننے سے پہلے تھا۔ اس نے فوراً اپنے وزیر کو بلایا، اور اس سے کہا "زرا دیکھو تو ہمارے الہ دین کا محل کہاں گیا؟"

وزیر بھی حیرت میں رہ گیا۔ اس نے بادشاہ سے کہا۔ "مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ سارا کام جادو کے زور سے ہورہا ہے۔ اور الہ دین کوئی جادوگر ہے۔"

اب تو بادشاہ کو الہ دین پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے حکم دیا کہ "جہاں کہیں بھی الہ دین نظر آئے اسے فوراً گرفتار کرکے میرے سامنے لایا جائے۔"

بادشاہ کے آدمی فوراً جنگل کی طرف گئے، وہاں انھوں نے

الہ دین کو گرفتار کر لیا اور اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال کے اُسے لے چلے۔ جب وہ اس طرح شہر میں داخل ہوئے تو لوگ حیران رہ گئے کہ کیا ہو گیا۔ وہ ڈر گئے کہ بادشاہ الہ دین سے ناراض ہو گیا اور اسے جان سے مار ڈالے گا۔ اس خیال سے وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ اس طرح الہ دین بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔ بادشاہ نے پہلے تو اس کو مارنے کے لیے حُکم دے دیا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ اگر الہ دین کو مارا گیا تو مُلک میں اس کے خلاف بغاوت ہو جائے گی تو بادشاہ نے اپنا حکم واپس لے لیا اور کہا۔" اسے چھوڑ دو۔"

الہ دین بادشاہ کے قدموں میں گر پڑا اور بولا۔" جہاں پناہ! مجھے میرا قصور بتائیے۔"

بادشاہ نے کہا۔" ہم سے اپنا قصور پوچھتا ہے۔ زرا کھڑکی میں سے دیکھ کہاں گیا وہ محل ـــــ اور کہاں ہے میری بیٹی۔"

الہ دین دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے سر جھکا کر کہا۔ " جہاں پناہ! مجھے کچھ پتا نہیں کہ کیا ہو گیا۔ میرے بھی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ایسا کیوں ہوا؟"

بادشاہ نے کہا " مجھے تمہارے محل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ البتہ مجھے اپنی بیٹی کی فکر ہے اگر تم فوراً میری بیٹی کو نہیں لاتے تو میں تمہارا سر کٹوا دوں گا۔"

الہ دین نے کہا " مجھے صرف چالیس دن کی مہلت دیجیے۔ میں اپنی بیوی کو خود تلاش کروں گا۔"

بادشاہ نے کہا" دور ہو جاؤ، سامنے سے اور شہزادی کو کہیں سے لے کر آؤ "

وہاں سے الہ دین باہر نکلا اور تین دن تک مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر چلتے چلتے وہ دریا کے کنارے پہنچا۔ وہ سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ میں اپنی شہزادی کو کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں کہ بے خیالی میں اس کا پاؤں پھسل گیا۔ اتفاق سے الہ دین کی اُنگلی میں وہی انگوٹھی تھی جو جادوگر نے اسے غار میں داخل ہوتے ہوئے پہنائی تھی۔ یہ انگوٹھی زمین سے رگڑ گئی۔ فوراً ہی وہ جن سامنے آ گیا اور بولا۔ " میں انگوٹھی کا جن ہوں اور جس کے پاس یہ انگوٹھی ہے، اس کا غلام ہوں "

الہ دین اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا " میرے بھائی! تم نے اس سے پہلے بھی میری جان بچائی تھی۔ ایک بار پھر میری مدد کرو۔ مجھے وہاں پہنچا دو، جہاں میرا محل اور میری شہزادی ہے " اس جن نے اسی وقت اسے افریقہ اس جگہ پہنچا دیا جہاں اس کا محل تھا۔ وہ چپ چاپ اس کھڑکی کے پاس آ گیا جو شہزادی کے کمرے کی کھڑکی تھی۔ اتفاق سے ایک کنیز نے جو کھڑکی کھولی تو اس کی نظر الہ دین پر پڑی اس نے فوراً شہزادی کو جا کر بتایا۔ شہزادی بھی دوڑی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی۔ وہ بھی الہ دین کو دیکھ کر پھولی نہ سمائی۔ اس نے کہا " تم پچھلے دروازے سے آ جاؤ۔ میں ابھی اپنی کنیز سے کھلواتی ہوں کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا "

زرا سی دیر میں الہ دین محل کے اندر پہنچ گیا۔ وہ بے حد خوش ہوا۔ اس نے شہزادی سے کہا " زرا یہ تو بتاؤ کہ وہ چراغ کہاں ہے۔؟"

اُس نے کہا " مجھے شک ہے کہ ساری گڑ بڑ چراغ کی وجہ سے ہوئی ہے۔" شہزادی نے چراغ کے بدلنے کا قصہ سُنایا اور بتایا کہ کس طرح یہ محل اُڑتا ہوا یہاں پہنچا ہے اور اب یہ بڈھے کے قبضے میں ہے۔"

الہ دین نے کہا" تم یہ بتاؤ کہ چراغ کہاں ہے۔؟"

شہزادی نے کہا" اس چراغ کو وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتا ہے اور ایک دن وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم میری بیوی بن جاؤ۔ اب الہ دین تم کو حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ یہ چراغ اب میرے قبضے میں ہے۔"

لیکن میں اس سے نفرت کرتی ہوں اور اس کی باتوں میں نہیں آئی۔"

الہ دین نے کہا" تم پریشان مت ہو۔ میں ابھی اس جادوگر کا انتظام کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ چپکے سے بازار گیا۔ وہاں اس نے ایک پاوڈر خریدا۔ یہ دراصل ایک خاص قسم کا زہر تھا۔ اُس نے شہزادی سے کہا" میں تم سے جیسا کہوں، ویسا کرو۔ آج جب جادوگر تمہارے پاس آئے تو تم بڑے اچھے کپڑے پہن کر اس کے پاس جاؤ اور اس سے کہنا کہ اب جبکہ الہ دین کو میرے

باپ نے مروا دیا ہوگا میں اُسے بھول گئی ہوں اور تمہارے ساتھ ہمیشہ کے لیے رہنا چاہتی ہوں۔ اس لیے اس خوشی میں بہت اچھی شراب کا انتظام کرو۔"

شہزادی نے کہا ــــــ "جب وہ شراب لے آئے تو میں کیا کروں۔"

الہ دین نے کہا ــــــ "تم چپکے سے اس کے گلاس میں یہ پاوڈر ملا دینا اور پھر اس کو اپنے ہاتھ سے پلا دینا۔ پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔"

شہزادی نے یہی کیا اور جب جادوگر آیا تو وہ اچھے اچھے کپڑے پہن کر اس کے پاس گئی اور بڑی محبّت سے بولی۔ "آج سے میں الہ دین کو بالکل بھول گئی ہوں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جب میرے باپ نے وہاں محل نہ دیکھا ہوگا تو اس نے الہ دین کو ضرور مروا دیا ہوگا۔ اس لیے اب ہم اور تم ایک ساتھ رہیں گے۔ آج سے تم میری آنکھوں میں ایک آنسو نہ پاؤ گے۔ اس لیے اس خوشی میں ہم دونوں آج بہت اچھی شراب پیئیں گے۔"

یہ سُن کر جادوگر بہت خوش ہوا۔ وہ دوڑا ہوا گیا اور ذرا سی دیر میں بہت اچھی شراب لے کر آیا۔ شہزادی نے موقع پاکر اس کے گلاس میں پاوڈر ڈال دیا' اور اپنے ہاتھ سے اسے پلانے لگی۔ جادوگر اتنا خوش ہوا کہ اس نے غٹا غٹ سارا گلاس ختم کردیا۔ ابھی شراب اس

کے پیٹ میں گئی تھی کہ وہ اکدم سے گرسوا پر گر کر مر گیا۔ جیسے ہی وہ مرا، الہ دین دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے وہ چراغ اس کی جیب میں سے نکالا اور اُسے رگڑا۔ اس کا رگڑنا تھا کہ جن سامنے آگیا اور بولا۔

"میں چراغ کا جن ہوں۔ جس کے پاس یہ چراغ ہے میں اس کا غلام ہوں۔"

الہ دین نے کہا۔ "میرے بھائی ہم سب کو محل سمیت چین میں ہمارے شہر میں پہنچا دو۔"

الہ دین کا کہنا تھا کہ زرا سی دیر میں یہ محل اُڑتا ہوا اپنی جگہ پر پہنچ گیا۔"

ادھر بادشاہ کا یہ عالم تھا کہ روزانہ صبح صبح وہ کھڑکی سے دیکھا کرتا تھا لیکن وہاں اسے صرف میدان دکھائی دیتا۔ آج جب وہ کھڑکی میں آیا تو دیکھتا ہے کہ محل اپنی جگہ پر موجود ہے۔ بادشاہ سوچنے لگا کہ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ وہ آنکھیں ملتا دوڑتا ہوا الہ دین کے محل کی طرف گیا۔ الہ دین نے بادشاہ کے استقبال کے لیے دروازے کھول دیے تو بادشاہ نے کہا "دور ہٹو، مجھے پہلے اپنی بیٹی سے ملنے دو۔" اس کے بعد میں تم سے بات کروں گا۔

شہزادی بھی بادشاہ کی آواز سُن کر دوڑی ہوئی آئی۔ بادشاہ نے اُسے سینے سے لگا لیا۔

شہزادی نے بادشاہ کو شروع سے آخر تک سارا قصہ

سُنایا دیا۔ اسے سُن کر بادشاہ کو اطمینان ہوا اور اس نے
الہ دین کو بھی سینے سے لگایا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔
اس نے سارے شہر میں منادی کرادی کہ آج شہزادی کے
آنے کی خوشی منائی جائے گی۔

پھر تو سب لوگ ہنسی خوشی رہنے لگے۔ جب بادشاہ
مرگیا تو الہ دین چین کے تخت پر بیٹھا اور اس نے پھر
برسوں تک رحم و انصاف کے ساتھ حکومت کی۔

قصہ ہارون رشید

اور سیدی نعمان کا
خواجہ حسن رسن فروش کا
ایک استاد کا
بابا عبداللہ کا

خلیفہ ہارون رشید کی ایک عادت یہ تھی کہ وہ اکثر رات کو بھیس بدل کر بغداد میں گھوما پھرا کرتے تھے تاکہ وہ اپنی رعایا کا حال خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ ان کا وزیر جعفر ہمیشہ اُن کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ ایک دن جب وہ پُل پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک اندھا پالتی مارے بیٹھا ہے اور بھیک مانگ رہا ہے۔ خلیفہ نے ایک دینار اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ لیکن فقیر نے خلیفہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ــــــ"اے میرے مالک! تو نے جس ہاتھ سے مجھے خیرات دی ہے، اسی ہاتھ سے میرے منہ پر تھپڑ مار۔" خلیفہ کے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ لیکن جب تک خلیفہ نے اس کو تھپڑ نہیں مارا، فقیر نے اسے وہاں سے ہلنے نہیں دیا۔ خلیفہ نے کہا۔" بڑے میاں! یہ کیا ظلم ہے کہ میں کسی بوڑھے آدمی کو اپنے ہاتھ

سے ماروں اور بلا وجہ گنہگار ہوں۔"

فقیر نے کہا ——— "بابا! مجھے معاف کرنا۔ میں مجبور ہوں اس لیے کہ میں نے عہد کیا ہے کہ جو کوئی مجھے خیرات دے گا، اسی کے ہاتھوں تھپڑ کھاؤں گا۔ اور جب تم کو یہ بات معلوم ہوگی کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے تو تم کو بھی میرے اوپر ترس نہ آئے گا۔" آخر مجبوراً خلیفہ نے اس کے تھپڑ مارا اور وہاں سے آگے بڑھا۔ ذرا سی دور جاکر خلیفہ نے وزیر جعفر سے کہا۔ "ضرور اس بوڑھے کا حال معلوم کرنا چاہیے کہ اس نے اتنا عجیب و غریب عہد کیا ہے۔ تم ایسا انتظام کرو کہ کل صبح یہ فقیر میرے دربار میں آئے۔"

جعفر نے کہا ——— "جیسا امیرالمومنین کا حکم ہے ویسا ہی ہوگا۔"

اب خلیفہ اور آگے بڑھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے ایک آدمی بیٹھا ہے اس نے سر اٹھایا اور قہقہہ لگا کر کہا۔ "خدا کی قسم جب بچوں کو پڑھاتا تھا تب بھی اتنا روپیہ نہیں کمایا ——— "خلیفہ یہ سنتے ہوئے آگے بڑھے اور بولے " جعفر! یہ آدمی استاد تھا لیکن اس کے باوجود بھیک مانگ رہا ہے۔ اس کا قصہ بھی سننا چاہیے۔ اسے بھی کل صبح دربار میں حاضر کرو۔"

جعفر نے کہا ——— "جیسا حکم امیرالمومنین کا ویسا

ہی ہوگا۔"

ذرا سی دور جانے کے بعد ان کی نظر ایک بڑی خوبصورت سفید گھوڑی پر پڑی۔ اس پر ایک نوجوان سواری کر رہا تھا اور اس کو بڑی بُری طرح پیٹ رہا تھا۔ اس کے آس پاس کچھ لوگ کھڑے بڑی بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس طرح پیٹ رہا تھا کہ گھوڑی کے منہ سے کف نکلنے لگا تھا اور اس کی بُری حالت تھی۔ خلیفہ کو اس غریب جانور پر بڑا ترس آیا اور اس نے راستہ چلنے والوں سے پوچھا: "یہ کیا تماشا ہے کہ ایک آدمی ایک بے زبان جانور کو اس بُری طرح پیٹ رہا ہے، اور تم لوگ کھڑے دیکھ رہے ہو۔"

ان لوگوں نے کہا۔ "اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ آدمی ایسا کیوں کرتا ہے۔ البتہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ یہ آدمی روزانہ اسی وقت یہاں آتا ہے اور اسی طرح اس گھوڑی کو مارتا ہے۔ لیکن یہ گھوڑی اس کی اپنی ہے، جو چاہے سو کرے، ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

خلیفہ نے وزیر جعفر سے کہا۔ "کل صبح اس نوجوان کو بھی حاضر کرو۔ تاکہ میں اس کا حال بھی معلوم کروں۔"

جعفر نے کہا۔ "جیسا امیرالمومنین کا حکم ہے، ویسا ہی ہوگا۔"

اب خلیفہ اور آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک

آدمی دونوں ہاتھوں سے خیرات بانٹ رہا ہے۔ خلیفہ ہارون رشید اس آدمی کو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک عام آدمی اس طرح خیرات کرے۔

خلیفہ نے کہا۔" اے جعفر! کل صبح یہ آدمی بھی حاضر ہو تاکہ مجھے اس کی اتنی بہت سی دولت کا حال بھی معلوم ہو۔"

اس کے بعد خلیفہ ہارون رشید اپنے محل واپس چلے گئے۔ اگلے دن خلیفہ دربار میں داخل ہوئے تو اُنھوں نے دیکھا کہ وہ چاروں آدمی پہلے سے وہاں موجود تھے، جنھیں خلیفہ نے پچھلی رات کو بلایا تھا۔ خلیفہ نے سب سے پہلے اس نوجوان کو اشارہ کیا جو اپنی گھوڑی کو بُری طرح پیٹ رہا تھا اور اس سے بولا ——— "اے نوجوان! کل رات میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تم اپنی گھوڑی کو اس بُری طرح پیٹ رہے تھے کہ وہ لہولہان ہوگئی تھی اور لوگوں کا کہنا تھا کہ تم اس کے ساتھ روزانہ یہی سلوک کرتے ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جانور بے زبان ہوتا ہے اور سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتا ہے۔ اگر تم اس کا معقول سبب نہیں بتاؤ گے تو میں تم کو بڑی سخت سزا دوں گا۔"

یہ سنتے ہی نوجوان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔

خلیفہ نے کہا۔" اے نوجوان! تم کسی سے مت ڈرو

اور اپنی بات کہو۔"

قصہ سیدی نعمان کا

اس نوجوان نے یہ سُن کر اپنی داستان بیان کی اور بولا۔
"اے امیرالمومنین! میرا نام سیدی نعمان ہے۔ میرا باپ بہت مال و دولت چھوڑ کر مرا۔ میں بڑے عیش و آرام کی زندگی گزارا کرتا تھا۔ لیکن میں نے شادی نہیں کی۔ یہ سوچتا تھا کہ یہی زندگی سب سے اچھی ہے۔ مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد مجھے خیال آیا کہ میرا گھر بھی بس جائے۔ میرے گھر میں بھی بچّوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ میں نے سوچا کہ میں کسی خوبصورت سی لڑکی سے شادی کروں۔ لیکن مجھے بچپن ہی سے رسم و رواج سے چڑ تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ کہیں سے کوئی بالکل اجنبی لڑکی لے آؤں اور اس سے شادی کرلوں۔ یہ سوچ کر میں نے طے کیا کہ جہاں غلاموں کا بازار لگتا ہے، وہاں سے کوئی خوبصورت سی لڑکی لے آؤں، جس کا کوئی رشتہ دار بھی نہ ہو۔ میں اس بازار میں جیسے ہی داخل ہوا، میری نظر ایک بہت خوبصورت گوری چٹی لڑکی پر پڑی۔ حالانکہ بازار میں ساری دنیا کے مختلف ملکوں کی ایک سے ایک لڑکیاں تھیں، لیکن مجھے جو لڑکی پسند آئی وہ اُن میں سب سے خوبصورت اور انوکھی سی تھی۔ میں نے سارے

بازار کی سیر کی، لیکن ہر بار گھوم پھر کر اُسی لڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا تھا۔ میں نے سچ پو چھیے تو اتنی خوبصورت لڑکی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں آپ کے سامنے اس کی خوبصورتی کو کن الفاظ میں بیان کروں۔ آپ اتنے نرم اور ریشمیں بالوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لوگ خوبصورت ہرن کی آنکھوں کی تعریف کرتے ہیں، چکور کی چال کی بڑائی کرتے ہیں۔ لیکن سچ پوچھیے تو وہ ان سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ میں نے منہ مانگے دام دیے اور اس کو اپنے گھر لے آیا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے آتے ہی میرے گھر میں ہر طرف اُجالا ہو گیا۔ رات کو جب ہم لوگ کھانا کھانے بیٹھے تو میں نے اس لڑکی میں ایک عجیب بات محسوس کی۔ جب میں نے اس کے بالوں کو چھوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں نے ٹھنڈے ٹھنڈے اور نرم نرم ریشم کے تاروں کو چھو لیا ہو۔ اب مجھے وہ ہر طرح سے ایک عجیب و غریب چیز معلوم ہونے لگی۔ وہ ہمارے طور طریقوں کو بھی نہیں سمجھتی تھی۔ میں نے سوچا کہ دھیرے دھیرے سب سیکھ جائے گی۔

جب ہمارے سامنے کھانا لگایا گیا، تو میں نے اپنے ہاتھوں سے کھانا شروع کیا لیکن دیکھتا کیا ہوں کہ اس نے اپنے پاس سے ایک باریک سی ہڈی نکالی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے کسی ننھے سے مُردہ بچّے کی ہڈی ہو۔

اور اس نے بڑے آہستہ آہستہ ایک اک چاول کا دانا
اٹھاکر کھانا شروع کردیا۔ اس نے مشکل سے دس بارہ
دانے کھائے ہوں گے کہ اپنا ہاتھ روک لیا۔ میں نے
سوچا کہ شاید اس نے پہلے روز تکلف کیا ہو۔ یہ بھی ہو
سکتا ہے کہ اس کے ملک میں لوگ اسی طرح کھانا کھاتے
ہوں۔ اس لیے میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔

میں نے اس کے سونے کے لیے ایک بڑا اچھا کمرہ
تیار کیا تھا اور اسے بہت آرام سے وہاں سلا دیا۔

اگلے روز صبح کو میں نے سوچا کہ آج اس کے
لیے انگریزی قسم کا کھانا تیار کرواؤں۔ شاید اسے ہمارا
کھانا پسند نہ ہو۔ لیکن میری بیوی نے اس دن بھی اسی
طرح کھانا کھایا۔ اب تو میں پریشان ہو گیا کہ آخر یہ
اتنا کھاکر کیسے جیے گی۔ لیکن یہ تو اس کا روز کا طریقہ
تھا۔ وہ مجھ سے بات بھی نہ کرتی تھی اور اس کا طریقہ
بھی ایسا تھا کہ خود میری ہمت نہ پڑتی تھی کہ میں اس
سے بات کروں۔ اس طرح دو ہفتے گزر گئے۔ میں بیان
نہیں کر سکتا کہ یہ دو ہفتے میں نے کیسے گذارے۔ آخر
ایک دن میں نے سوچا کہ اس کے کمرے میں جا کر
دیکھوں کہ وہ کیا کرتی ہے۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا
تو کمرہ خالی تھا۔ لیکن اچانک میری نظر جو پچھلے دروازے پر
پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بڑے آہستہ آہستہ دروازے

سے نکل رہی ہے اور اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ اس کے سر کا ایک اک بال کھڑا ہوا ہے۔ میں اُس کو اس عالم میں دیکھ کر کانپ اٹھا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرا خون جم کر رہ گیا۔ میں نے طے کر لیا کہ میں اس کے پیچھے پیچھے جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ وہ شہر کے راستوں سے اس طرح گزر رہی تھی، جیسے وہ ہمیشہ سے یہاں رہتی آئی ہے اور تمام راستوں کو اچھی طرح پہچانتی ہے۔ آخر کار وہ آبادی سے نکل کر ویرانے میں داخل ہوئی۔ پھر اس نے قبرستان کا رُخ کیا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہاں اس کے کسی رشتہ دار کی قبر ہو، —— میں ایک قبر کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک قبر میں سے جیسے کوئی سایہ سا نکلا۔ اس سایے نے ایک نئے مرے ہوئے آدمی کا سر ایک تھالی میں رکھ کر اس کو پیش کیا۔ اس کو دیکھ کر میری بیوی کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور اس نے اپنے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھانا شروع کیا۔ یہ منظر دیکھ کر میرے منہ سے چیخ نکل پڑی۔ وہ اکدم سے پلٹی اور اُس نے مجھے جو دیکھا تو ایسے جیسے کوئی بھوکی شیرنی اپنے شکار کو دیکھتی ہے اور اس نے منہ ہی منہ میں کچھ بڑ بڑانا شروع کیا۔ میرے سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے پھر اس نے پڑھ کر جو پھونکا تو میں کُتا بن گیا۔ اتنے میں نہ جانے کتنے

سایے مجھ پر ٹوٹ پڑے اور انھوں نے مجھے زور زور
سے مارنا شروع کر دیا۔ میں تو سمجھا کہ اب میں مرجاؤں گا
لیکن پھر جو میں ایک بار بھاگا تو قبروں پر سے کودتا
نکل گیا۔ انھوں نے کچھ دور تک تو میرا پیچھا کیا، لیکن
پھر چھوڑ دیا ـــــ میں گرتا پڑتا شہر میں داخل ہوا،
لیکن یہاں پر کتّوں نے میرا پیچھا کیا۔ اب میں ان کتّوں
سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے ایک دُکان دکھائی
دی میں اس دکان میں داخل ہو گیا۔ یہ دُکان ایک قصائی
کی تھی۔ قصائی نے کتّوں کو بھگایا اور میرے سامنے
گوشت کا ایک ٹکڑا ڈال دیا۔ میں اس کے پاس پہنچا
اور دُم ہلانے لگا۔ میں اس کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ مجھے
گوشت کا لالچ نہیں ہے بلکہ میں تو تیرے قدموں میں
پڑا رہنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے مارنے کے لیے ایک
لکڑی اٹھائی۔ چنانچہ میں اس دُکان سے نکل کر بھاگا۔
اس کے پاس ہی ایک نان بائی کی دُکان تھی۔ وہ بیٹھا
روٹی کھا رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر ایک روٹی کا
ٹکڑا میری طرف پھینکا۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور دُم
ہلانے لگا۔ جیسے اس کا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔ اس
نان بائی نے جیسے میرے دل کی بات سمجھ لی۔ اس
نے مجھے رہنے کے لیے اپنی دُکان کا ایک کونا دے
دیا۔ اب میں بڑے آرام سے اس کونے میں پڑا رہتا۔

وہ ہر طرح سے میرا خیال رکھتا۔ اور میں بھی اس سے بہت مانوس ہو گیا۔ اب تو میں ہر وقت اس کے پاس رہتا۔ جب وہ کہیں جاتا، سیٹی بجاتا اور میں اس کے ساتھ ہو لیتا۔

اس طرح نانبائی کے یہاں رہتے ہوئے مجھے کئی ہفتے ہو گئے۔ اتفاق سے ایک روز ایک بوڑھی عورت دُکان میں روٹی خریدنے کے لیے آئی۔ وہ پیسے دے کر دُکان سے باہر جا رہی تھی کہ نانبائی نے سکّوں کو پرکھا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس میں ایک سِکّہ کھوٹا ہے۔ اس نے بڑھیا کو آواز دے کر کہا۔ "بڑی بی! اگر بُرا نہ مانو تو یہ سکّہ واپس لے لو اور دوسرا سِکّہ دے دو۔"

بڑھیا نے غصّہ ہو کر کہا۔ "واہ دوسرا کیوں دے دوں۔ کیا یہ سکّے میرے بنائے ہوتے ہیں۔ بڑا آیا کہیں سے، دوسرا سکّہ لینے والا۔"

اب تو نانبائی کو بھی غصّہ آ گیا۔ اس نے کہا۔ "میں یہ کھوٹا سِکّہ لے کر کیا کروں گا۔ اسے تو یہ کُتّا بھی دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ کھوٹا ہے۔" چنانچہ اس نے بڑھیا کو ذلیل کرنے کے لیے وہ تمام سِکّے میرے سامنے پھینک دیے اور بولا ـــــــــ "ذرا دیکھ کر تو بتانا اس میں کون سا کھوٹا ہے۔" میں نے اپنے پنجوں سے ایک ایک سِکّے کو ہٹایا اور کھوٹا سِکّہ نکال دیا۔ یہ دیکھ کر نانبائی حیرت

میں رہ گیا اور چیخ کر بولا۔" ارے دیکھو تو خدا کی قدرت یہ کتّا کتنا ہوشیار ہے کہ اس نے یہ کھوٹا سِکّہ پہچان لیا"——— بڑھیا بے حد شرمندہ ہوئی اور اس نے فوراً دوسرا سِکّہ دے دیا اور چُپ چاپ چلی گئی۔

اب تو نانبائی اتنا خوش ہوا کہ اس نے پاس پڑوس کے دُکانداروں کو بلایا اور میرا یہ کارنامہ خوب بڑھا چڑھا کر لوگوں کو سُنایا۔

یہ سُن کر ہر ایک حیرت میں پڑ گیا۔ کیونکہ کسی نے ایسا کتّا نہیں دیکھا تھا جو کھرے کھوٹے میں فرق کر سکے۔ اب تو یہ حال تھا کہ جسے دیکھیے کھوٹے سِکّے لاکر میرا امتحان لے رہا تھا۔ میں بھی بڑی پھرتی کے ساتھ کھرے سِکّوں میں سے کھوٹے سِکّے کو ڈھونڈ لیتا۔ اب تو میری شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی اور لوگ بڑے شوق سے مجھے دیکھنے آتے۔ نانبائی کی دُکان پر مجھے دیکھنے کے لیے ہر وقت بھیڑ لگی رہتی اور اس کی دُکان خوب چلنے لگی۔ قصائی یہ دیکھ کر جلنے لگا۔ وہ سڑک کے کتّوں کو میری طرف دوڑاتا، لیکن نانبائی خوب اچھی طرح میری حفاظت کرتا، اس لیے مجھے کسی سے ڈر نہ لگتا۔ اس کے علاوہ تمام آنے جانے والے مجھے پہچاننے لگے تھے، اس لیے جہاں کوئی مجھے دیکھتا تو وہ دوسرے کتّوں سے خود ہی مجھے بچاتا۔

غرض اس طرح میری زندگی بڑے مزے میں گزر رہی

تھی۔ ایک دن ایک بڑھیا اس کی دُکان میں روٹی لینے آئی۔ اُس کے پاس ایک کھوٹا سِکّہ تھا۔ اس نے اور لوگوں کی طرح بہت سے سکّوں میں یہ سکّہ ڈال کر میرے سامنے پھینک دیا۔ میں نے پنجوں سے وہی سِکّہ اُٹھا لیا۔ اس عورت پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ جب وہ باہر جانے لگی تو اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ یہ عورت مجھے اپنے ساتھ لے کر گھر میں داخل ہوئی۔ مجھے بڑے پیار سے اندر لے گئی۔ وہاں کمرے میں ایک لڑکی بیٹھی تھی وہ کار چوبی کام کے بڑے خوبصورت کپڑے پہنے ہوئی تھی۔ بڑھیا نے کہا۔" بیٹی! یہی وہ کتّا ہے جو کھرے کھوٹے سکّے پہچان لیتا ہے۔ لیکن مجھے یہ عام کتّوں جیسا نظر نہیں آتا۔ اس میں کوئی خاص بات ضرور ہے۔" بڑھیا کی یہ لڑکی جادو جانتی تھی۔ وہ بولی۔" اماں اگر یہ بات ہے تو ابھی معلوم ہوجاتا ہے۔ میں ابھی اپنا کام کرتی ہوں ——"

یہ لڑکی پانی سے بھرا ہوا ایک برتن لے کر آئی۔ اس نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر پھونکا اور اس میں سے کچھ پانی ہاتھ میں لے کر میرے اوپر چھڑکا اور بولی۔ اگر تم واقعی کتے ہو تو کتے رہو۔ لیکن اگر تم آدمی ہو تو اپنی اصلی صورت پر آجاؤ۔"

اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے کہ میں پھر آدمی کی طرح کھڑا ہو گیا۔ میں آنکھیں پھاڑے اُدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پھر اکدم سے میں اس کے قدموں میں گر پڑا، اور میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ "خدا کرے کہ تم بہت دن زندہ رہو۔ تم نے میرے ساتھ جو احسان کیا ہے میں اسے زندگی بھر نہیں بھول سکتا اور کبھی اس کی قیمت نہیں چکا سکتا۔"

پھر میں نے ان کو اپنا سارا حال سنایا۔ انھوں نے ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا۔ بڑھیا نے کہا۔ "تم خدا کا شکر ادا کرو کہ پھر سے آدمی بن گئے ورنہ ساری زندگی یوں ہی گزر جاتی۔ البتہ یہ تم نے کیا کیا تھا کہ اپنے شہر کو چھوڑ کر ایک اجنبی عورت سے شادی کرلی۔"

تب میں نے اس سے کہا۔ "اماں! مجھ سے بڑی غلطی ہوئی اور خدا نے مجھے اس کی پوری پوری سزا دے دی۔ اب میری درخواست ہے کہ اگر مجھے اپنی لڑکی کے لائق سمجھیں تو میں آپ کی لڑکی سے شادی کروں۔"

بڑھیا نے اپنی لڑکی سے پوچھا۔ "بیٹی! تم بھی بتاؤ کہ کیا تم کو یہ رشتہ پسند ہے ——— مجھے تو یہ نوجوان بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔"

لڑکی نے کہا۔ "اماں! جیسی تمہاری مرضی۔ مجھے اس میں کیا عذر ہے۔ لیکن ابھی تو ان کو اس چڑیل سے بچانا

ہے۔ کہیں وہ پھر ان کو کسی مصیبت میں نہ ڈال دے۔
اس لیے اس کا کوئی انتظام کرنا چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ
اندر گئی، اور ذرا سی دیر بعد واپس آکر بولی۔" میں نے
اپنی کتابوں میں دیکھا، وہ عورت موجود ہے۔ لیکن اس
وقت وہ گھر سے باہر ہے۔ اس نے نوکروں پر بھی اثر
ڈالا ہے۔ گویا تمھارے نہ ہونے سے وہ بہت پریشان
ہے تم اس وقت اس کے پہنچنے سے پہلے سیدھے گھر
جاؤ۔ اور تھوڑا سا پانی اپنے ساتھ لے جاؤ جیسے وہ گھر
میں داخل ہو، اس پر پانی چھڑک دینا اور کہنا۔' بس
اب تم عورت سے گھوڑی بن جاؤ'۔ وہ فوراً گھوڑی بن
جائے گی۔ اس کے بعد تم اس کو خوب چابک سے مارنا۔
اتنا مارنا، اتنا مارنا کہ اس کے جسم سے خون نکلنے لگے
اور اسی طرح روزانہ پٹائی کرنا۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو
مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔"

میں اپنے گھر پہنچا۔ ذرا سی دیر میں وہ گھر میں داخل
ہوئی۔ میں پہلے سے تیار تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے اس
پر پانی چھڑک دیا۔ اور کہا۔" اے چڑیل! اب تو عورت سے
گھوڑی بن جا۔" میری زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے کہ وہ
گھوڑی بن گئی۔ اس کے بعد میرا یہ روز کا پروگرام بن
گیا کہ میں پُل والے میدان میں روزانہ رات کو آتا ہوں اور
اس گھوڑی کی خوب پٹائی کرتا ہوں۔"

ہارون رشید نے جب یہ سُنا تو کہا۔" اے نوجوان! اب میری سمجھ میں پوری بات آگئی۔ واقعی اس عورت کو ٹھیک سزا مل رہی ہے۔ لیکن تم اپنی نئی بیوی سے کہہ کر ایسی ترکیب کرو کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور تمہارا بھی اس روز روز کی مار پیٹ سے پیچھا چھوٹ جائے۔"

اس کے بعد ہارون رشید نے اس آدمی کی طرف دیکھا جو دونوں ہاتھوں سے خیرات دے رہا تھا اور اس سے پوچھا ——— "کل رات میں نے تم کو پُل کے پاس بڑی فیاضی سے خیرات کرتے دیکھا اور مجھے یہ خیال آیا کہ تمہاری زندگی میں ضرور کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے جس نے تم کو اتنا مخیّر کردیا ہے۔ تم بھی اپنی زندگی کا حال سناؤ۔"

قصہ خواجہ حسن رسن فروش کا

اُس آدمی نے کہا:" امیرالمومنین! میری کہانی بھی بہت عجیب و غریب ہے۔ میرا نام خواجہ حسن ہے۔ میرے باپ دادا رسّی بٹنے اور بیچنے کا کام کرتے ہیں۔ میں بھی یہی کام کرتا ہوں۔ اس لیے لوگ مجھے خواجہ حسن رسن فروش کہتے ہیں کسی نہ کسی طرح میں اپنے بچّوں کا پیٹ پالتا اور بڑی تنگی سے گزر بسر کرتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ رسّی کا کام ایسا کام نہیں ہے کہ اس میں لوگ زیادہ روپیہ کما سکیں. لیکن میں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتا تھا۔

ایک روز میں اپنی دُکان میں بیٹھا ہوا رسیّوں کو لپیٹ رہا تھا کہ اتنے میں شہر کے دو دولت مند حضرات میری دکان میں داخل ہوئے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے بحث کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک جس کا نام سعد تھا اپنے دوست سعدی سے کہہ رہا تھا: "میرے دوست! میں تمھاری بات کو کاٹنا نہیں چاہتا لیکن اب بھی یہ سمجھتا ہوں کہ انسان جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ تدبیر سے حاصل کرتا ہے۔ لیکن اگر کسی انسان کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو تو وہ تدبیر بھی کیا کرے۔ ایسے موقع پر تدبیر بھی کوئی کام نہیں کرتی ——— اس لیے بغیر روپے کے کیسے کام کرے۔"

سعدی نے کہا: "میرے پیارے دوست! مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ میں تمھاری بات نہیں مان سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں تو تقدیر کا قائل ہوں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ ہر آدمی اپنی تقدیر کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔ تقدیر کسی کو بادشاہ سے فقیر اور فقیر کو بادشاہ بنا سکتی ہے۔ ویسے آدمی لاکھ تدبیر کرے، لیکن کچھ کام نہیں ہو سکتا۔ کسی کو تم کتنے ہی روپے کیوں نہ دے دو لیکن اگر اس کی تقدیر میں ہیچ ہے تو وہ اس روپے سے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ روپیہ بھی بیکار جائے گا۔"

سعد نے کہا: "بھائی! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو کبھی قائل نہیں کر سکتے۔ اس لیے کیوں نہ ہم

اپنی بات کا تجربہ کریں اور اس کے لیے کسی غریب آدمی کو ڈھونڈیں۔ کچھ روپیہ اسے دے دیں، اور پھر دیکھیں کہ اگر اس کی تقدیر میں نہیں ہے تو وہ اس روپیہ سے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ روپیہ بھی بے کار جائے گا۔"

سعد نے کہا۔" بھائی! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو کبھی قائل نہیں کر سکتے۔ اس لیے کیوں نہ ہم اپنی بات کا تجربہ کریں اور اس کے لیے کسی غریب آدمی کو ڈھونڈیں۔ کچھ روپیہ اسے دے دیں اور پھر دیکھیں کہ وہ اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے یا نہیں ____"

سعدی نے کہا۔" اچھا بھائی، یہی صحیح ہے، لیکن اس کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ حسن رسن فروش ہی پر اس کا تجربہ کیا جائے۔ یہ آدمی غریب بھی ہے اور محنتی بھی۔"

سعد نے بھی یہ رائے پسند کی اور اس نے مجھ سے کہا۔" اے حسن! میں جانتا ہوں کہ تمہارے بال بچے ہیں ور تم بڑی مشکل سے زندگی گزار رہے ہو، لیکن اس کے لیے تم مجبور بھی ہو، اس لیے کہ اس کام میں تم کو جو کچھ ملتا ہے، تمہارا خرچ اس سے زیادہ ہے چنانچہ تمہارا کاروبار بڑھ نہیں پاتا۔ میں تم کو سونے کے دو سو دینار دیتا ہوں۔ تم اسے لے لو اور اپنے کاروبار کو خوب بڑھاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا کاروبار خوب ترقی کرے گا۔"

یہ بات سن کر میں خوش ہو گیا۔ میں نے ان دونوں حضرات کو دعا دی اور یہ رقم قبول کر لی اور ان سے کہا "میں اب اتنی بڑی رقم سے اپنے کاروبار کو اتنا بڑھاؤں گا اتنا بڑھاؤں گا کہ مجھے یقین ہے کہ ایک دن میرا کاروبار بہت ترقی کرے گا۔"

سعد کو میری بات سے اطمینان ہو گیا اور اس نے سونے کے دو سو دینار کی تھیلی میرے حوالے کر دی۔ میں نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ پھر وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے میری دکان سے چلے گئے۔ میں نے سوچا کہ میں اب اتنی بڑی رقم رکھوں تو کہاں رکھوں۔ میرا گھر تو اتنا بڑا نہیں ہے۔ آخر میری سمجھ میں ایک بات آگئی۔ میں نے اس میں سے دس دینار تو خرچ کے لیے نکال لے، اور ایک سو نوّے دینار اپنی پگڑی میں خوب اچھی طرح رکھے اور یہ سوچا کہ اس سے بہتر جگہ اور کیا ہو گی۔ اب میں نے رسّی بٹنے کے لیے کچھ سن خریدی۔ پھر میں سوچنے لگا کہ برسوں گزر گئے میں نے اور میرے بال بچوں نے گوشت کی شکل نہیں دیکھی کیوں نہ آج بھیڑ کا گوشت کھایا جائے۔ چنانچہ میں نے بازار سے ایک بھیڑ کی ٹانگ خریدی۔ اور اسے لے کر چلا۔ ابھی اس کو لے کر چلا ہی تھا کہ اتنے میں ایک چیل نے زور سے جھپٹا مارا، بھیڑ کی ٹانگ منہ میں دبائی اور میری پگڑی پنجوں سے پکڑ کر اڑ گئی۔

میں دیکھتا رہ گیا۔ راستہ چلنے والوں نے بہتیرا شور مچایا لیکن زرا سی دیر میں چیل یہ جا وہ جا، نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں روتا پیٹتا رہ گیا۔ میں نے گھر جا کر اپنی بیوی کو سارا حال سُنایا۔ اس کو بھی سُن کر افسوس ہوا، لیکن وہ بیچاری بھی کیا کرتی۔ آخر میں رو پیٹ کر بیٹھ رہا اور میری زندگی جوں کی توں رہی۔ میں نے یہ قصّہ پڑوسیوں کو بھی سُنایا۔ لیکن ان کو یقین نہیں آیا۔ اور بچے مجھے دیکھ کر چلّاتے۔ "وہ دیکھو حسن رسن فروش کو، جس کا پگڑی کے ساتھ دماغ بھی چیل لے گئی۔"

الغرض کسی نہ کسی طرح دس مہینے گزر گئے کہ ایک دن سعد اور سعدی دُکان میں داخل ہوئے۔ سعد نے آتے ہی کہا۔ "آؤ زرا اپنے دوست حسن کا حال معلوم کریں کہ اس کا کاروبار کیسا چل رہا ہے یقیناً اب تو بہت زوروں پر ہوگا۔"

سعدی نے کہا۔ "ارے بھائی، تم تو غلّہ پکنے سے پہلے کاٹنے کی بات کر رہے ہو۔ مجھے تو حسن کے حال میں کوئی فرق نظر نہیں آرہا ہے۔ وہ دیکھو اس کا تو وہی حال ہے جو پہلے تھا۔"

تب سعد نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا ——— "ارے بھائی حسن! کیا معاملہ ہے۔ تم تو واقعی اسی حال میں ہو۔ میں تو سمجھا کہ تم نے بہت ترقی کی ہوگی۔ آخر کیا

قصہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرے آقا! میں کیا عرض کروں کہ تقدیر نے میرے ساتھ کیا کھیل کھیلا۔" یہ کہہ کر میں نے سارا قِصہ سُنایا۔

میں جب یہ قصہ بیان کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ سعدی چُپ چاپ مسکرا رہا تھا۔ سعد نے کہا —— "بھائی! بات یہ ہے کہ مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں آتا۔ بھلا کہیں چیل بھی اس طرح روپے لے کر اُڑ سکتی ہے مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ تم نے یہ سب دینار عیش و عشرت میں ختم کر دیے۔ خیر میں اپنی بات سے مایوس نہیں ہوں۔ میں تم کو پھر دو سو دینار دے کر ایک موقع اور دیتا ہوں۔ کیونکہ ایک ہی بار کا تجربہ، تجربہ نہیں ہوتا۔" یہ کہہ کر اس نے پھر مجھے دو سو سونے کے دینار دے دیے اور بولا —— "دیکھو اب اسے پگڑی میں مت رکھنا۔" میں نے اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے دُکان سے باہر چلے گئے۔

اس بار میں نے سوچا کہ میں کسی کو یہ راز نہ بتاؤں گا۔ ویسے ہی لوگ کیا کم میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔ جیسے ہی شام کو میرے بیوی بچے باہر گئے۔ میں نے یہ تھیلی ایک مٹکی میں چھپا دی، جس میں بھُس بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس میں سے صرف دس دینار اپنا سن خریدنے کے لیے نکالے اور بازار

چلا گیا۔ جب میں بازار گیا تو میرے پیچھے ایک آدمی سَر دھونے کی کھَل بیچنے کے لیے وہاں آیا۔ میری بیوی کے پاس روپے پیسے تو تھے نہیں، اس نے اسی بھُس کی مٹکی کو دے کر اس آدمی سے کھَل بدل لی۔ اس بیچاری کو کیا معلوم تھا کہ اس میں میں نے ایک سو نوّے سونے کے دینار رکھے ہیں۔ جب میں گھر آیا تو دیکھا کہ وہ مٹکی غائب تھی۔ میں نے بیوی سے پوچھا "وہ مٹکی کہاں ہے؟"

میری بیوی نے خوش ہوکر یہ خبر سُنائی کہ "اس نے کھَل کے بدلے میں اس بھُوسی کی مٹکی کو بدل دیا۔"

یہ سُننا تھا کہ میں نے اپنا سَر پیٹ لیا۔ اور کہا "تم نے میری اور اپنے ان بچّوں کی تقدیر کو مٹّی کے مول دے دیا۔ ہائے یہ میری آخری اُمید تھی جو ختم ہوئی"——— پھر میں نے اس کو سارا قصّہ سُنایا۔ یہ سُن کر تو اس کی حالت بھی خراب ہوگئی——— "ہائے یہ میں نے کیا کیا——— اب اس آدمی کو کہاں ڈھونڈوں۔ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں" لیکن اب کیا ہو سکتا تھا جو کچھ ہونا تھا، ہوچکا تھا۔ میری بیوی کو اس بات پر بھی غصّہ آتا تھا کہ میں نے اس پر بھروسہ کیوں نہیں کیا اور اس کو یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی ورنہ ایسا ہوتا ہی کیوں۔

بات بھی سچ تھی۔ وہ بہت چیخی چلائی۔ پھر میں نے اُسے خاموش کیا، اور کہا کہ ہمارے پڑوسی سُنیں گے تو

اور ہنسیں گے۔ ایسے ہی وہ ہمارا کیا کم مذاق اُڑاتے ہیں۔
خیر کسی نہ کسی طرح سے وہ وقت گزر گیا اور ہم اپنی زندگی اسی طرح گزارتے رہے اور کچھ دنوں میں اس بات کو بالکل بھول گئے۔ البتہ مجھے اپنے ان ہمدردوں کا خیال آکر افسوس ہوتا ہے کہ وہ اب آئیں گے تو میں ان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔

اس بار وہ بہت دنوں کے بعد ادھر آئے۔ ابھی وہ دُکان کے باہر ہی تھے کہ مجھے ان کی آواز سُنائی دی، جیسے وہ میرے بارے میں باتیں کر رہے ہوں۔
"اب دیکھو ہمارے حسن کا کیا حال ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اس کا کاروبار کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہوگا۔"
"میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ ابھی وہیں کا وہیں ہوگا۔ کہیں روپے سے بھی آدمی ترقی کرتا ہے۔"
یہ باتیں کرتے ہوئے وہ دُکان کے اندر داخل ہوئے۔ میں اپنے رسّی بٹنے کے کام میں اسی طرح مصروف رہا جیسے میں نے انھیں دیکھا ہی نہ ہو۔ اتنے میں انھوں نے مجھے بڑے زور سے سلام کیا۔ میں نے سَر اُٹھا کر جواب دیا اور اپنی ساری بپتا ان کو سُنائی۔
سعد نے کہا۔ "بھئی میں اب کیا کر سکتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ چیل کیسے اتنا روپیہ لے گئی اور اب یہ خوانچہ والا اس کو لوٹ کر لے

گیا۔ لیکن مجھ میں اور تجربہ کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ البتہ یہ یقین ہے کہ یہ سب تقدیر کا کھیل ہے۔ آدمی تقدیر کے سامنے بے بس ہے" ـــــ سعدی نے ایک پیسے کا سکّہ اٹھایا اور حسن کو دیتے ہوئے کہا کہ "میرا دوست بہت دولت مند ہے جو اس نے چار سو دینار دے ڈالے۔ میں تو یہی دے سکتا ہوں، جسے مچھیرے اپنے جال میں استعمال کرتے ہیں۔ شاید یہ تم کو کبھی بہت دولت مند بنا دے۔" میں نے اسے لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

سعد نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ میں نے ان دونوں کو بہت ادب سے سلام کیا۔ پھر دونوں دوست چلے گئے۔

رات کو جب میں لیٹا تو میں نے وہ سکّہ اُٹھا کر ایک طرف ڈال دیا اور سو گیا۔

ابھی آدھی رات ہوئی تھی کہ ہمارے پڑوسی مچھیرے کی بیوی نے ہمیں جگا دیا۔ دراصل مچھیرا شکار پر جا رہا تھا اور جال کا ایک سکّہ جو اس میں بندھا رہتا تھا کہیں گر گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر بہت تلاش کیا، لیکن نہیں ملا۔ بازار میں دُکانیں بند ہو گئی تھیں۔ مجبوراً اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ "پڑوسن کو جگا کر اس سے پوچھے شاید اس کے پاس کوئی پیسے کا سکّہ مل جائے تو میرا کام بن جائے ورنہ پھر آج مچھلی پکڑنے نہیں جا سکیں گے۔"

چنانچہ اس کی بیوی ہمارے یہاں آئی اور کہنے لگی۔
"مجھے بہت افسوس ہے کہ میں اتنی رات گئے جگا رہی ہوں، لیکن بات یہ ہے کہ میرے شوہر کو جال کے لیے ایک سیسے کے سکے کی ضرورت ہے تاکہ وہ شکار پر جائے۔ اگر تمھارے پاس کوئی ٹکڑا ہو تو دے دو۔"

مجھے اکدم سے اپنا سیسے کا سکہ یاد آگیا جو سعدی نے مجھے دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو پڑوسی کی مدد کے لیے یہ بہترین موقع ہے۔ میں نے وہ سیسے کا سکہ اٹھاکر اُسے دے دیا۔ یہ سکہ پاکر وہ بہت خوش ہوئی اور بولی۔" تم لوگوں نے اس وقت میری بڑی مدد کی ہے۔ اب جو پہلی مچھلی اس جال میں آئے گی وہ میں تمھیں لاکر دوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ مچھیرے نے جو جال ڈالا تو سب سے پہلے ایک بڑی سی مچھلی جال میں آئی اور اس کے بعد اس نے چھوٹی چھوٹی بہت سی مچھلیاں پکڑیں۔ اس نے شام کو وہ چھوٹی مچھلیاں تو بازار میں بیچ ڈالیں لیکن وہ بڑی مچھلی لاکر حسن کو دی اور بولا ——" بھائی حسن! یہ معمولی تحفہ قبول کرلو —— تم نے میری بڑی مدد کی۔"

میں نے کہا۔" بھائی ایک زرا سے سیسے کے سکے کے بدلے تم اتنی بڑی مچھلی لے آئے۔ میں تمھارا شکریہ کیسے ادا کروں۔"

میں نے اپنی بیوی سے کہا۔" سعدی نے سچ کہا تھا——

یہ دیکھو ایک ذرا سے پیسے کے ٹکڑے سے اتنی بڑی مچھلی
ملی. جو بڑے بڑے لوگوں کو نہیں ملتی. یہ پیسے کا سکہ
ہمارے لیے بڑا مبارک ثابت ہوا۔"

حسن کی بیوی نے کہا "یہ تو صحیح ہے کہ ایسی مچھلی
مشکل سے ملتی ہے مگر اس کو پکانے کے لیے ہمارے پاس
گھی کہاں سے آئے گا۔"

حسن نے کہا "تم اس کی فکر مت کرو. تم اس کے
ٹکڑے کرکے، اس کو بھون کر کھلا دو۔"

حسن کی بیوی نے جو مچھلی کا پیٹ کاٹا تو اس میں
ایک چمکتی ہوئی چیز نکلی۔ اب جو اسے دھویا تو وہ اور زیادہ
چمکنے لگا۔ یہ انڈے کے برابر تھا۔ ہم نے اسے اُٹھا کر
بچوں کو دے دیا تاکہ بچے اپنی ماں کو زیادہ پریشان نہ کریں۔
کھانا کھانے کے بعد اب جو ہم کمرے میں گئے تو وہاں
خوب روشنی ہو رہی تھی۔ حالانکہ اس وقت کسی نے چراغ
نہیں جلایا تھا۔ اب تو مجھے اور زیادہ خوشی ہوئی۔ میں نے
بیوی سے کہا "دیکھو سعدی کے سکے سے فائدہ ہوا کہ اب
ہمیں تیل کا خرچ بچ گیا۔ اب تو ہم اسی سے کام چلائیں گے۔"

اس کے بعد ہم لوگ خوب مزے میں مچھلی کھا کر سوئے
صبح کو اُٹھے تو ذرا سی دیر میں اس عجیب و غریب چراغ
کا حال سارے محلے کو معلوم ہو گیا۔ ہمارے پڑوس میں ایک
یہودی جوہری رہتا تھا۔ اس کی بیوی بھی دیکھنے آئی اور

میری بیوی سے بولی ۔" پڑوسن جی! ذرا میں بھی تو وہ انڈا دیکھوں جس کا سارے محلّے میں چرچا ہے۔" حسن کی بیوی نے اُسے دکھایا تو وہ خوش ہوکر بولی۔" پڑوسن بی! ایسا ہی ایک انڈا ہمارے پاس ہے اگر تم اس کو ہمارے ہاتھ بیچ دو تو میں اس کے بدلے تم کو دس دینار دوں گی۔"

بچوں نے جو یہ سُنا تو انھوں نے کہا کہ ہم تو اسے کسی قیمت پر نہ بیچیں گے۔ جب میں واپس آیا تو میری بیوی نے بتایا کہ یہودی کی بیوی دس دینار میں اسے خریدنا چاہتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کوئی قیمتی چیز ہے ورنہ بھلا یہودی اور اسے خریدے۔ میں نے بیوی سے کہا ——" دیکھو وہ یہودن پھر آئے گی۔ لیکن تم مجھ سے پوچھے بغیر اسے مت بیچنا۔"

میرا اندازہ صحیح تھا شام کو وہ یہودن آئی اور بولی۔ "خدا نے تم کو یہ چیز دی ہے اور میرے پاس اس کا جوڑا ہے۔ میرے شوہر نے کہا ہے کہ بیس دینار دے کر لے لوں۔ اگر تم دے سکو تو اچھا ہے۔ در اصل بات یہ ہے کہ ہمارا جوڑا پورا ہوجائے گا ورنہ اس کے دام اتنے کہاں ہیں۔"

میری بیوی نے کہا۔" میں اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتی۔ اس لیے میں کیا کہوں۔"

ذرا سی دیر کے بعد میں گھر آگیا۔ یہودن نے میرے

سامنے بھی وہی بات کہی؛ میں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا البتہ اشارے سے منع کردیا۔

میری بات سُن کر یہودن کو بہت تکلیف ہوئی اور وہ میری خوشامد کرنے لگی۔

میں نے کہا۔" میں ہرگز ہرگز اتنا سستا نہیں بیچ سکتا۔"

یہودن نے کہا ——" اچھی بات ہے اگر تم بیس دینار میں نہیں دیتے تو پچاس دینار میں تو دے دو۔"

میں نے صاف منع کردیا ——" میں نے تم سے منع کردیا کہ میں اتنا سستا ہرگز نہیں بیچ سکتا۔"

اس پر وہ بڑی تیزی سے چلی گئی، لیکن پھر پلٹ کر آئی اور بولی۔" اچھی بات ہے تو لاؤ پھر سو دینار میں تو دوگے۔ ویسے میں اس سے زیادہ نہیں دے سکتی کیونکہ میں نے اپنے شوہر سے نہیں پوچھا —— یہ تو میں اپنی طرف سے کہہ رہی ہوں۔"

میں نے کہا۔" بی پڑوسن! تم نہیں جانتیں کہ یہ کتنی قیمتی چیز ہے۔ اگر تم اس کے ایک لاکھ دینار دینے کے لیے تیار ہو تو لے سکتی ہو۔ میں اس سے ایک پیسہ کم پر نہ بیچوں گا۔ تم چاہو تو دوسرے جوہریوں سے اس کے دام معلوم کرسکتی ہو۔"

جب اس نے میری بات سُنی تو پہلے گھبرا گئی، پھر

بولی۔" دراصل یہ خرید و فروخت کا کام میرا شوہر کرتا ہے۔ اب میں کہوں گی کہ وہ خود اس کو دیکھ لے۔ اگر وہ پسند کرے گا تو خود خرید لے گا۔ البتہ تم سے ایک بات یہ کہنا ہے کہ جب تک وہ دیکھ نہ لے، تم اس کو ہرگز نہ بیچنا۔"

میں نے کہا۔" بی پڑوسن! یہ میں وعدہ کرتا ہوں"

وہ عورت چلی گئی۔

اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی یہ کوئی قیمتی چیز ہے اور سمندر میں ایسے بیش بہا خزانے ہوتے ہیں۔ ابھی میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہودی نے دروازہ کھٹکھٹایا ــــ میں نے اُسے اندر بُلا لیا۔ پہلے تو وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ اس کے بعد بولا۔" میری بیوی وہ انڈا خریدنا چاہتی ہے اور ضِد کر رہی ہے کہ اسے ضرور خریدوا دو ــــ تم جانتے ہو کہ عورت کی ضد تو پوری کرنی ہی پڑتی ہے، اس لیے مجبورًا میں تم سے کہنے آیا ہوں کہ اسے میرے ہاتھ بیچ دو۔"

میں نے کہا۔" بھائی! میں اسے بیچنا نہیں چاہتا تھا۔ دراصل غلطی سے میری زبان سے اس کی قیمت نکل گئی۔ تمہاری بیوی نے بہت زور دیا' ورنہ یہ تو دس لاکھ دینار میں بھی مہنگا نہیں۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم اس کو خریدنا چاہتے ہو تو میں اس کے ایک لاکھ دینار لوں گا اور اِس وقت کے بعد ہرگز ہرگز تمہارے

ہاتھ نہیں فروخت کروں گا۔"

یہودی سمجھ گیا کہ میں واقعی اس سے کم میں نہ بیچوں گا تو مجھ سے بولا۔" اچھا لاؤ تمھاری ضد ہے تو یہی سہی۔ باہر میرے ملازم ایک لاکھ سونے کے دینار لیے کھڑے ہیں ــــ"

میں نے جو دروازہ کھولا تو واقعی وہ لوگ وہاں موجود تھے۔ یہودی نے فوراً وہ رقم میرے سامنے گن دی اور میں نے انڈا اس کے حوالے کیا۔ وہ اسے لے کر چلا گیا۔

اب تو میں لکھ پتی ہو چکا تھا اور اتنی دولت دیکھ کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جتنے رسّی بنانے والے تھے ان سب کا ایک جلسہ کیا اور کہا۔" میرے بھائیو! اللہ نے مجھے بہت دولت دی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سب کو میری ذات سے فائدہ پہنچے۔ اس لیے تم لوگ میری طرف سے کام کرو۔ میں ہر روز تمھاری مزدوری دوں گا اور تم کو اپنی روزی کی فکر نہ رہے گی اور مزے کی زندگی گزارو گے۔"

میری بات سن کر یہ سب لوگ بہت خوش ہوئے اور اب یہ سب میرا کام کرنے لگے۔ چند روز کے اندر یہ کام بہت بڑھ گیا۔ رسّی بٹنے والے بھی خوش حال ہو گئے اور میرا کاروبار بھی چل نکلا اور میری دولت دن دونی

رات چوگنی بڑھنے لگی۔

اس کے بعد میں نے بڑا شاندار مکان بنایا، اور ایک شاندار دُکان کھولی۔ ایک دن کیا ہوا کہ سعد اور سعدی مجھ سے ملنے آئے۔ وہ سیدھے میری پرانی دُکان میں پہنچے جو ان دنوں بند تھی۔ وہ سمجھے کہ میں مر گیا ہوں۔ لیکن پڑوس کے دُکانداروں نے بتایا کہ میں اب بغداد کے دولت مند دکانداروں میں ہوں۔ یہ سُن کر وہ حیرت میں پڑ گئے اور سیدھے میرے نئے مکان میں آئے۔ ملازمہ نے مجھے بتایا کہ سعد اور سعدی نامی دو آدمی مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میں ننگے پاؤں دوڑا گیا اور انھیں اپنے ساتھ لے آیا۔ اور انھیں اپنی ساری داستان سُنائی۔ سعدی نے کہا "دیکھا میرے دوست یہ ہیں تقدیر کے کھیل۔"

ابھی یہ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں میرے لڑکے کھیلتے ہوئے آئے اور بولے "بابا! دیکھو کتنا اچھا چیل کا گھونسلا ہے، جب چیل اُڑ گئی تو ہم اُٹھا لائے۔ یہ کپڑے کا گھونسلا ہے اور اس میں چیل کے ننھے مُنّے بچے ہیں۔ اب جو میں نے غور سے دیکھا تو یہ میری ہی پگڑی تھی۔ میں نے پگڑی سے چیل کے بچوں کو اُٹھا کر ایک طرف رکھا اور پگڑی جو کھولی تو اس میں ایک سو نوّے دینار تھے۔

اب تو سعد کو یقین آگیا کہ واقعی میں سچا تھا اور میری پگڑی کو چیل اُڑا کر لے گئی تھی۔

ابھی ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرا ایک غلام مٹکا لیے آرہا ہے۔ وہ غلام کہنے لگا کہ یہ بھوسی ہے جو میں گھوڑے کے لیے بازار سے لایا ہوں۔ اب جو میں نے اس میں ہاتھ ڈال کر دیکھا تو اس میں ایک سو نوّے دینار کی تھیلی تھی جو میں نے اپنی بیوی سے چھپا کر رکھی تھی۔

یہ دیکھ کر سعد اور سعدی بہت خوش ہوئے اور انھیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ میں نے اُن سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ سچ مچ میری پگڑی چیل لے گئی تھی اور یہ کہ میری بیوی نے غلطی سے کھل کے بدلے میں بھوسی کا مٹکا دے دیا تھا۔

اس کے بعد میں، سعد، اور سعدی تینوں ایک ساتھ دوستوں کی طرح رہنے لگے۔ میرے کاروبار نے بہت ترقی کی۔ اس روز سے میرا یہ دستور ہے کہ میں پُل پر جاکر دونوں ہاتھوں سے خیرات کرتا ہوں اور اس کے باوجود میری دولت بڑھتی جاتی ہے۔"

خلیفہ یہ سُن کر بہت خوش ہوا اور اس نے اپنے وزیر سے اشارہ کیا۔ وزیر نے ایک صندوقچہ لاکر رکھا۔ اس میں وہی انڈا تھا۔ خلیفہ نے کہا کہ "جس دن تم نے بیچا، اسی دن میں نے اسے خرید لیا۔"

اب بادشاہ نے اُستاد سے کہا کہ " سامنے آؤ اور

اپنی کہانی سُناؤ۔"

قصہ ایک اُستاد کا

"امیرالمومنین! میرا قصہ بھی کچھ کم انوکھا نہیں ہے۔ میں نے اپنی زندگی ایک استاد کی حیثیت سے شروع کی۔ میرے مدرسے میں ۲۴ بچے پڑھتے تھے۔ میں ان بچوں پر بڑی سختی کرتا تھا اور انھیں زرا بھی کھیلنے کودنے کا موقع نہ دیتا تھا۔ سورج ڈوبنے سے پہلے انھیں چھٹی نہ دیتا۔ وہ دن بھر پڑھتے اور پڑھنے کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا کام نہ تھا۔ یہاں تک کہ کبھی ایک دوسرے سے بات بھی نہ کر سکتے تھے۔ ان پر اتنی سختی کا یہ نتیجہ ہوا کہ میں آج اس حال میں پہنچا ہوں۔

ایک دن میں پڑھارہا تھا کہ اتنے میں سب بچے ایک ساتھ کھڑے ہو گئے اور ایک آواز میں بولے۔" مولوی صاحب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔؟ آپ کا رنگ بالکل پیلا پڑ گیا ہے۔" اُن کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ حالانکہ میری طبیعت بالکل ٹھیک تھی لیکن ان کو دیکھ کر اور اُن کی بات سُن کر واقعی ایسا لگا کہ جیسے میں سچ مچ بیمار ہوں' لیکن میں نے کہا——" نہیں ایسی کوئی بات نہیں تم اپنا کام کرو۔"

زرا سی دیر کے بعد میرے سب سے بڑے شاگرد

نے کھڑے ہو کر کہا۔" خدا کرے کہ آپ جلد اچھے ہو جائیں
—— اس وقت بہتر ہے کہ آپ آرام کریں۔ میں
آپ کی جگہ لڑکوں کو پڑھا دوں گا۔"

اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ ضرور میری طبیعت خراب ہے۔ میں نے اپنے اس شاگرد کو پڑھانے کے لیے کہہ دیا اور خود گھر میں چلا گیا۔ مجھے بہت کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے بیوی سے کہا۔" میری طبیعت خراب ہے، جلدی سے بستر لگا دو۔" میں بڑے زور زور سے کراہ رہا تھا۔ اتنے میں دروازے پر میرے اس بڑے شاگرد نے دستک دی اور میری بیوی کو چوبیس درہم دیئے اور کہا
"مولوی صاحب کی صحت کے لیے ہم سب دعا کر رہے ہیں —— یہ درہم لڑکوں نے مولوی صاحب کے علاج کے لیے اکٹھا کئے ہیں تا کہ کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔"

میرے اوپر لڑکوں کی اس محبت کا بہت اثر ہوا اور میں نے انھیں اس روز کی چھٹی دے دی۔ وہ لڑکے خوشی خوشی گھر چلے گئے۔ میں تمام دن اپنی بیماری کے بارے میں سوچتا رہا۔ اگلے دن جب وہ لڑکا مجھے دیکھنے آیا تو میں نے دیکھا کہ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے —— "یہ آپ کا کیا حال ہے۔ تمام لڑکے آپ کی وجہ سے پریشان ہیں۔ آپ آرام کیجیے۔ ہماری فکر نہ کیجیے۔"

میرے دل پر اس کا بہت اثر ہوا۔ میں نے اس سے کہا۔ "آج تم ہی لڑکوں کو پڑھا دو۔"

وہ لڑکا اپنے ساتھیوں کو خبر سنانے چلا گیا۔

اس کے بعد وہ ہر روز اسی طرح آتا اور مجھے دیکھ کر اور پریشان ہوتا اور میں اس سے لڑکوں کو پڑھانے کے لیے کہتا۔ اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا ــــ ایک بار پھر وہ چوبیس درہم لے کر آیا۔ اور اس نے بہت پریشان ہو کر کہا ــــ "آپ کے شاگردوں نے علاج کے لیے یہ پیسے دیے ہیں اور کہا ہے کہ آپ ان کی طرف سے پریشان نہ ہوں ــــ"

اس بات کا میرے اوپر اور زیادہ اثر ہوا۔ میں نے سوچا کہ یہ بیماری میرے لیے نعمت ہو گئی ہے کہ اتنا روپیہ گھر بیٹھے مل رہا ہے۔ لیکن چند روز میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں بیمار نہیں ہوں۔ یہ لڑکے مجھے دھوکا دے رہے ہیں۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ اگر کسی طرح مجھے گھر بیٹھے روپیہ ملتا رہے تو میرا کیا نقصان ہے۔ چنانچہ میں بھی ان سے یہی کہتا رہا کہ میری طبیعت بہت خراب ہے کوئی غذا ہضم نہیں ہوتی ــــ حالانکہ میں نے اس زمانے میں جو غذا کھائی وہ مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔

ایک روز وہ لڑکا جب گھر میں داخل ہوا تو میں انڈا کھانے ہی والا تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی سارا

انڈا گرم گرم منہ میں رکھ لیا۔ اس لڑکے نے مجھے دیکھا
تو میرا گلا پھولا ہوا تھا۔ کہنے لگا کہ آپ کا منہ پک گیا
ہے۔ اس میں مواد ہے۔ اس مواد کو نکال دینا چاہیے۔
وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ میں غسل خانے کی طرف بھاگا
اور میں نے اندر جاکر اسے اُگل دیا۔ لیکن میرا سارا منہ
بُری طرح جل چکا تھا۔ چنانچہ اس میں سچ مچ مواد پڑ گیا
اور مجھے جرّاح سے آپریشن کرانا پڑا۔ جس سے میری شکل
اتنی خراب ہوگئی کہ آپ خود دیکھ لیجیے۔

جب میرا زخم ٹھیک ہو گیا تو پھر میں نے لڑکوں
کو پڑھانا شروع کردیا۔ اب تو میں ان پر اور زیادہ
سختی کرتا اور زرا سی بات پر سخت سے سخت سزا دیتا۔
وہ میرے اشاروں پر عمل کرنے لگے۔ جہاں میں کھانستا
وہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوجاتے اور کہتے "اللہ رحم کرے"
اور میں کہتا "جاؤ تم کو معاف کیا"

اس طرح بہت دنوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک روز
میں لڑکوں کو پک نِک کے لیے لے گیا۔ کچھ دور جانے کے
بعد پیاس لگی۔ وہاں کنواں نظر آیا۔ میں نے سوچا کہ میں
کنویں کے نیچے جاکر خود پانی لے آؤں۔ وہاں کوئی
رسّی تو تھی نہیں۔ میں نے کئی پگڑیوں کو ایک ساتھ باندھا
اور اپنی کمر میں گانٹھ لگالی اور لڑکوں سے کہا کہ مجھے
کنویں میں اُتار دو۔ ابھی وہ مجھے نیچے اُتار رہے

تھے کہ اچانک مجھے کھانسی آگئی۔ کھانسی کا آنا تھا کہ ان کے ہاتھ سے پگڑی چھوٹ گئی۔ میں دھڑام سے پانی میں گرا اور وہ ہاتھ باندھ کر عادت کے مطابق بولے۔" اللہ رحم کرے۔"

میں اس کا جواب کیا دیتا ——— میں ڈوبا تو نہیں البتہ میرے پاؤں کی دو ہڈیاں اور ایک کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں بڑے زور سے چیخ رہا تھا۔ لیکن لڑکے مارے ڈر کے وہاں سے بھاگ گئے۔ پھر مجھے کچھ راہگیروں نے نکالا اور ایک گدھے پر بٹھا کر گھر پہنچایا۔

اس روز سے آج تک میری حالت خراب ہے۔ میں نے پڑھانے کا کام چھوڑ دیا ہے اور سڑک پر بھیک مانگتا ہوں تاکہ اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال سکوں یہ ہے میری کہانی۔"

اب خلیفہ نے اس اندھے فقیر سے کہا کہ" تم اپنی کہانی سناؤ کہ خیرات لینے کے بعد تھپڑ مارنے کے لیے کہتے ہو۔"

قصہ بابا عبداللہ کا

اندھے فقیر نے اپنی کہانی اس طرح شروع کی:

"امیرالمومنین! مجھے بابا عبداللہ کہتے ہیں۔ میرے ماں باپ میرے لیے بہت دولت چھوڑ کر مرے۔ میں نے بڑی بے دردی سے خرچ کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ

بہت تھوڑے سے درہم بچے اب مجھے ہوش آیا۔ میں نے سوچا کہ مجھے بھی کوئی ترکیب کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے اَسّی اونٹ خریدے اور انھیں کرایے پر چلایا کرتا۔ اس طرح مجھے فائدہ ہوا۔ اب میں سوچنے لگا کہ کسی طرح میں اتنا روپیہ کماؤں، اتنا روپیہ کہ ایک دن دُنیا کا سب سے دولت مند آدمی بن جاؤں۔ چنانچہ دن بھر میں اِسی دُھن میں مُبتلا رہتا۔

ایک دن میں اونٹوں پر مال لاد کر بصرے لے گیا۔ وہاں سے جب واپس آرہا تھا تو میں نے ایک جگہ راستے میں اونٹوں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ ابھی میں اپنا کھانا کھانے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ ایک درویش آیا اور وہ آکر وہیں بیٹھ گیا۔ ہم لوگوں نے ایک دوسرے کا حال پوچھا—— اس نے اپنا کھانا نکالا اور پھر ہم دونوں نے مِل کر کھانا کھایا—— میں نے اُسے اپنے کاروبار کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہا کہ میری یہ آرزو ہے کہ ایک دن میں دنیا کا سب سے دولت مند آدمی بن جاؤں۔ میری یہ بات سُن کر وہ درویش ہنسا اور بولا۔ " بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ اس میں تو میں بھی تمھاری مدد کرسکتا ہوں۔ پھر تمھارے پاس اتنی دولت ہو جائے گی کہ ساری دُنیا کے لوگ تم پر رشک کریں گے یہاں سے تھوڑی دُور پر ایک ایسا خزانہ ہے، جس کا

کوئی حساب نہیں۔ تم اپنے تمام اونٹوں پر بھرلو، تب بھی وہ ختم نہ ہوگا۔"

میں نے کہا۔" بابا! مجھے جلدی سے اس خزانے کا پتا بتاؤ کہ وہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

اس نے کہا۔" اپنے اونٹوں کو لے کر میرے پیچھے پیچھے چلو۔"

میں اس درویش کے پیچھے ہو لیا، اور دل میں سوچنے لگا کہ آج میرے خواب کے پورے ہونے کا دن آ گیا ہے۔ ہم لوگ چلتے چلتے ایک وادی میں پہنچے ــــ درویش نے کہا کہ" تم اپنے اونٹوں کو زمین پر بٹھادو تاکہ ہم لوگوں کو اس خزانے کے لادنے میں کوئی دقت نہ ہو۔" یہ کہہ کر درویش ذرا سی دور چلا گیا۔ میں نے اونٹوں کو زمین پر بٹھایا۔ اس نے آگ سلگائی، اس میں لوبان جیسی کوئی چیز ڈالی اور پھر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ ذرا سی دیر میں دھواں پھیل گیا، اور جب دھواں صاف ہوا تو مجھے ایسا لگا کہ دو چٹانیں الگ ہو گئیں۔ وہاں ہر طرف سونے چاندی اور جواہرات کے ڈھیر نظر آئے۔ میں نے جلدی جلدی سونے کے ٹکڑے اونٹوں پر لادنا شروع کر دیے۔ لیکن درویش نے کہا۔" ارے بھائی کیا بے وقوفی کرتے ہو۔ اگر سونا بھروگے تو اتنا وزن یہ اونٹ کیسے لے جا سکیں گے۔ البتہ تم ہیرے جواہرات بھرو تو بات

بھی ہے۔ وزن بھی کم ہوگا اور ان کی قیمت بھی زیادہ ملے گی۔"

میں نے اس کی بات مان لی اور ہیرے جواہرات اپنے اونٹوں پر لادے۔ اس درمیان میں درویش نے ایک چھوٹے سے برتن میں کچھ جواہرات بھرے اور اپنے لبادے میں اس کو چھپا لیا۔ اس کے بعد اس نے پھر آگ سلگائی اور اس میں کوئی چیز ڈال کر اس کو پھونکا ـــــ پہلے تو دھواں نکلا اور اس کے بعد جب دھواں صاف ہوا تو وہ دونوں چٹانیں ایک دوسرے سے مل گئیں۔

درویش نے کہا۔" بابا عبداللہ! آؤ اب اس جگہ چلیں جہاں سے ہم لوگ یہاں آئے تھے پھر ہم اس دولت کو برابر تقسیم کرلیں۔"

اب ہم اُدھر چلے۔ جب اس جگہ پہنچے جہاں سے روانہ ہوئے تھے تو مجھے اس کا افسوس ہوا کہ یہ درویش مفت میں یہ دولت اور چالیس اونٹ لینا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ اونٹ بھی میرے ہیں اور ان پر لادنے کا کام بھی میں نے کیا ہے۔ درویش نے تو پتا ہی بتایا ہے۔ پھر یہ کہ اگر اس کے بس میں لے جانا ہی ہوتا تو یہ مجھے ہی کیوں بتاتا۔ یقیناً یہ اکیلا بے بس تھا۔ اس لیے اِس دولت کا اصل مالک تو میں ہی ہوا۔ چنانچہ جیسے ہی تقسیم کا وقت آیا۔ میں نے کہا۔" بابا! آپ تو درویش

ہیں۔ آپ کو دُنیا کے مال و دولت سے کیا واسطہ۔ البتہ اگر محض راستہ بتانے کی قیمت لینا چاہتے ہیں تو یہ اور بات ہے۔"

میں نے سوچا کہ درویش میری بات سُن کر بہت ناراض ہوگا، لیکن اس پر تو کوئی اثر نہ ہوا اس نے کہا "بھائی تم ٹھیک کہتے ہو کہ مجھے دنیا کے مال و دولت سے کیا واسطہ۔ لیکن میں تو اسے غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں اور جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ میں راستہ بتانے کی قیمت چاہتا ہوں تو بات یہ ہے کہ اگر میں چاہتا تو تم کو ہرگز نہ بتاتا اور تم کو پتا نہ چلتا۔ اب میں تم سے کہوں گا کہ زیادہ لالچ نہ کرو۔ اگر اتنی دولت کا سب سے چھوٹا حصہ بھی تم کو ملتا تو تم بغداد کے سب سے دولت مند انسان ہوتے۔ یہ بڑی دولت ہے۔ تم اب لالچ چھوڑ دو جو کچھ اللہ نے دیا اس پر صبر اور شکر کرو ــــــ"

حالانکہ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ میں بے ایمانی کی بات کر رہا ہوں لیکن میں نے پھر بھی، درویش سے کہا "میں نے تمھاری بات مان لی، لیکن مجھے بتاؤ کہ تم اتنے بہت سے اونٹوں کو کس طرح چلا کر لے جاؤ گے۔ یہ کس طرح تمھارے قابو میں آئیں گے۔ اس لیے میری رائے ہے کہ تم چالیس اونٹوں کے بجائے تھوڑے سے

اونٹ لے جاؤ۔ اور تم کو تو خزانے کا بھید معلوم ہے۔ جب تمھارا جی چاہے تم پھر اس خزانے سے ہیرے جواہرات بھر کر لے جانا۔"

درویش نے کہا۔" بابا عبداللہ! تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ مجھے اس بات کا بالکل خیال ہی نہ آیا۔ اچھا تم ایسا کرو کہ چالیس کے بجائے سیدھے بیس اونٹوں کو چھانٹ کر مجھے دے دو۔ میں انھیں لے جاؤں گا۔"

مجھے اس بات پر دل ہی دل میں بڑی حیرت ہوئی کہ درویش اتنی آسانی سے میری بات مان گیا۔ چنانچہ میں نے اس کے لیے بیس اونٹ چھانٹ دیے اور ساٹھ کو لے کر بغداد کی طرف چل پڑا۔ وہ درویش بصرے کے راستے پر چلا گیا۔

ابھی میں تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ارے بلا وجہ یہ بیس اونٹ دیے، حالانکہ اس درویش کے قبضے میں تو سارے کا سارا خزانہ ہے۔ میں نے تو بیس اونٹوں کو کھویا اور اس پر لدے ہوئے ہیرے جواہرات سے الگ ہاتھ دھویا۔ اس کا خیال آنا تھا کہ میں نے اپنے اونٹوں کو ٹھہرایا اور بصرے کی سڑک کی طرف دوڑا۔ میں نے چیخ چیخ کر آواز دی۔ وہ درویش میری آواز سن کر ٹھہر گیا۔ میں نے اس کے نزدیک جا کر کہا۔" میرے بھائی! میری

ایک درخواست اور ہے ـــــ تم صرف دس اونٹ رکھ لو کیونکہ بیس کو تم چلا نہیں سکتے یہ اونٹ تم کو بہت پریشان کریں گے۔ میں تو خیر ایک وقت میں سو سو اونٹوں کو لے کر چل سکتا ہوں۔ کیونکہ میرا تو کام ہی یہی ہے۔"

درویش نے فوراً میری بات مان لی، اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے دس اونٹ دے دیے۔ اب میں ستّر اونٹوں کا مالک تھا۔ امیرالمومنین! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اتنے بڑے خزانے نے مجھے مطمئن کردیا ہوگا۔ ہرگز نہیں اس کے برخلاف میرا لالچ اور بڑھا۔ میں نے درویش کے ہاتھوں کو چوما، اور اُس سے کہا کہ "جب تم نے اتنا کچھ مجھے دے دیا تو پھر یہ دس اونٹ بھی لے جاکر کیا کروگے۔ جب چاہو تم اس خزانے سے لا سکتے ہو۔"

درویش نے بڑی محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔" تم سچ کہتے ہو۔ جاؤ سب اونٹ لے جاؤ اور ہمیشہ نیکی کے کام کرنا۔ غریب غربا کی مدد کرنا، اور مجھے یاد کرنا۔"

اب میں اَسّی کے اَسّی اونٹوں کا مالک ہو گیا تھا اور مارے خوشی کے پھولا نہیں سما رہا تھا ـــ لیکن پھر بھی لالچ نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ میں نے کہا۔" بابا! مجھے ایک بات کا افسوس ہے کہ تم نے اتنا کچھ دے دیا لیکن کچھ جواہرات اپنے لبادے میں چھپا کر رکھ لیے۔ آخر

تم ان کا کیا کرو گے۔ وہ بھی مجھے دے دو۔ میں زندگی بھر تم کو نہیں بھولوں گا۔"

درویش نے خوشی کے ساتھ وہ جواہرات بھی اپنے لبادے سے نکال کر مجھے دے دیے۔ اور بولا۔" بھائی عبداللہ! جاؤ یہ بھی تمھارا ہے۔ اب بتاؤ تم اور کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔" تم نے آگ میں جو چیز ڈالی تھی وہ کیا تھی۔ اگر تم وہ بھی مجھے دے دو تو میں تمہارا احسان کبھی نہ بھولوں گا۔"

درویش نے کہا۔" بھائی عبداللہ! یہ ایک عجیب چیز ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ اگر اس کو کوئی بائیں آنکھ میں لگا لے تو اس کو ساری دنیا کے خزانے نظر آئیں گے اور اگر غلطی سے داہنی آنکھ میں لگ جائے تو اندھا ہو جائے گا۔"

میں نے کہا ــــــ" بھائی میرے! تم اس کو میری بائیں آنکھ میں لگا دو تاکہ میں اس کی خاصیت کو دیکھ سکوں اور مجھے اس کی سچائی معلوم ہو۔"

درویش نے اسے میری بائیں آنکھ میں لگا دیا۔ جیسے ہی وہ میری بائیں آنکھ میں لگا، مجھے ایسا لگا جیسے زمین کے سارے خزانے میری آنکھوں کے سامنے چلے آرہے ہیں۔ کہیں سونا چاندی ہے تو کہیں ہیرے جواہرات بھرے ہوئے ہیں۔ میں انھیں دیکھتا رہا۔ جب میں تھک گیا تو

میں نے اپنی داہنی آنکھ کھولی، پھر میں اپنی جگہ پر کھڑا نظر آیا۔ میں بے حد خوش ہوا اور اب مجھے درویش کی کرامات کا صحیح اندازہ ہوا۔

لیکن میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ درویش جھوٹ بول رہا ہے۔ دراصل یہ اگر میری داہنی آنکھ میں بھی لگ جائے تو پھر یہ سارے خزانے میرے اپنے ہو جائیں گے۔ میں نے اُس سے کہا کہ " تم نے سب کچھ دے دیا لیکن اتنی سی کنجوسی کیوں کر رہے ہو۔ اسے میری داہنی آنکھ میں لگا دو۔" وہ درویش جانے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ " میں تم کو ہرگز جانے نہ دوں گا۔ جب تک تم میرے ساتھ یہ آخری نیکی نہیں کر دوگے۔"

درویش نے کہا۔" بھائی عبداللہ! تم اپنے ساتھ ظلم کر رہے ہو۔ اب بھی میری بات مان لو۔ تم اندھے ہو جاؤگے اور زندگی بھر ایسے ہی رہوگے۔ میں نے تمہارے ساتھ نیکی کی ہے۔ یہ بُرائی مجھ سے مت کرواؤ۔"

لیکن میں نہیں مانا۔ آخر درویش نے میری داہنی آنکھ میں اسے لگا دیا۔ اس کا لگانا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں اندھا ہو گیا۔ وہ درویش میرے اسّی کے اسّی اونٹ ہانک کر لے گیا۔ میں چلاتا رہا کہ میری آنکھیں ٹھیک کر دو۔ مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں زمین پر پڑا درد سے چیخ رہا تھا، مگر

وہاں کون تھا جو میری سنتا۔ کچھ دنوں کے بعد بصرے سے ایک قافلہ آیا۔ اس نے مجھے وہاں سے اٹھایا اور یہاں پہنچا دیا۔ اس روز سے میرا دستور ہے کہ میں یہاں کھڑے ہو کر بھیک مانگتا ہوں اور جو کوئی بھیک دیتا ہے، اس سے کہتا ہوں کہ میرے تھپڑ بھی مارے تاکہ اپنے لالچ کی سزا مجھے برابر ملتی رہے۔ اے امیرالمومنین! یہ ہے میری کہانی! —— اور میں چاہتا ہوں کہ یہاں جو لوگ بھی بیٹھے ہیں، وہ میرے ایک ایک تھپڑ ماریں کیونکہ میرے لالچ کی اس سے کم اور کوئی سزا نہیں ہو سکتی۔"

خلیفہ نے کہا "واقعی تم نے جو کام کیا ہے وہ برا ہے۔ لیکن تم نے اپنی غلطی کو محسوس کر لیا ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ خدا تمھارے گناہ معاف کر دے گا۔ آیندہ کے لیے میں یہ انتظام کرتا ہوں کہ خزانے سے تم کو روزانہ دس دینار ملا کریں گے۔ تاکہ تم اپنی زندگی اچھی طرح گزار سکو۔ اسی طرح مولوی صاحب کو بھی دس دینار ملا کریں گے۔" اس کے ساتھ ہی خواجہ حسن اور سیدی نعمان کو بھی دربار میں بڑا اعزاز دیا اور ان کو عزت کے ساتھ رخصت کیا۔

فسانہ عجائب

باپو اور بچے

چلو چاند پر چلیں

گاندھی اہنسا کا سپاہی

ہند کی مایہ ناز ہستیاں و دیگر مضامین

مصنف
بی۔ شیخ علی
صفحات:176
قیمت:-/22 روپے

جنگل کی کہانی

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान

National Council for Promotion of Urdu Language
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066